جلد ۳۶ شمارہ ۱۴ مورخہ ۸ صفر ۱۴۰۵ھ / ۲ نومبر ۱۹۸۴ء جمعۃ المبارک

مندرجات

مدیر مسئول
محمد عطاء اللہ حنیف

مجلسِ ادارت
حافظ صلاح الدین یوسف
علیم ناصری ایم اے

معاون

بدل اشتراک: سالانہ ۵۰ روپے — فی پرچہ ۱½ روپیہ — ممالک غیر سے ۲۰ پونڈ

بسم اللہ الرحمن الرحیم
المسلم ڈائری سنہ ۱۹۸۵ء
اللہ تعالیٰ کے کرم سے قرآن و سنت کے احکام سے مزین اور
شرک و بدعت کی نشاندہی کے ساتھ عنقریب شائع کی جا رہی ہے
احباب جماعت دینی اور کاروباری اداروں کے اشتہارات
جلد بھیج دیں۔ صاحب علم ضروری معلومات اور قیمتی مشوروں سے نوازیں
نرخ اشتہارات ملاحظہ ہوں
مکمل صفحہ ۵۰۰/- نصف صفحہ ۲۷۵/- چوتھائی صفحہ ۱۵۰/- روپے
ہر مشتہر کو ایک ڈائری مفت دی جائے گی۔
ڈائری کی پیشگی قیمت بیس ۲۰ روپے ہے۔
بیرونی ممالک کے احباب خرچہ ڈاک خود برداشت کریں گے۔
ناظم مدرسہ دار السلام کلیال
وادی سون ● ضلع خوشاب

کشمینا اون
کشمینا اون جیسی کوئی اون نہیں
حاجی محمد ابراہیم اینڈ سنز
۶۲۔ شاہ عالم مارکیٹ، لاہور
فون: ۶۶۱۳۵

نام بھی اچھا — کام بھی اچھا
صوفی سوپ ہے سب سے اچھا
صوفی سوپ
گذشتہ اٹھائیس ۲۸ سال سے آزمایا ہوا
صوفی سوپ ہر قسم کے کپڑوں کی دھلائی کے لئے
تمام صابنوں اور پوڈروں سے بہتر ہے۔
تار: صوفی سوپ
فون: ۶۴۵۲۲
۵۴۵۲۳
صوفی سوپ فیکٹری رجسٹرڈ
۳۹ نیلنگ روڈ
لاہور

فون دفتر الاعتصام
— ۵۴۴۰۶ —
جلد — ۳۶
شمارہ — ۱۴

مذہبی سیاسی اور سماجی ہر قسم کے جلوسوں پر پابندی لگائی جانی چاہیئے

ہم الاعتصام کے ۱۹ اکتوبر ۱۹۸۴ء کے شمارے میں انہی ادارتی کالموں میں یہ گزارش کر چکے ہیں کہ سڑکوں پر جلوس نکالنا کوئی اسلامی خدمت نہیں بلکہ محض نمائش اور ہنگامہ آرائی ہے جو سنجیدہ قوموں کا شیوہ نہیں۔ آخر میں یہ گزارش کی گئی تھی کہ ہر قسم کے جلوسوں پر قدغن لگائی جانی چاہیئے۔ یہ طریق کار قطعاً مذہب کا خاصا نہیں — ہم اپنی ان معروضات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے ۱۳ اکتوبر کے اخبار جنگ میں شائع ہونے والی دو مقتدر اور معزز شخصیات کی آراء کا حوالہ دینا ضروری خیال کرتے ہیں جو اپنے اپنے حلقوں میں خاصی بلند و بالا اور عمومی طور پہ دینی افق کی نامور شخصیتیں ہیں۔ ہماری مراد مجلس شوریٰ کے سابق رکن ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور مجلس شوریٰ ہی کے موجودہ رکن مولانا مفتی محمد حسین نعیمی صاحب سے ہے۔ ان دونوں حضرات کی ملتی جلتی رائے ہے کہ جلوسوں سے نقص امن بھی واقع ہوتا ہے اور یہ محض جذبات کے اظہار کا ہی طریقہ ہے۔ گویا جلوسوں کی اپنی کوئی دینی حیثیت نہیں ہے۔ لہٰذا ان پر پابندی لگانی چاہیئے — یعنی

ع متفق گردید رائے بو علی با رائے من

ہماری حکومت جو اس وقت انتخابات کا وعدہ بھی کر چکی ہے اور ان کے انعقاد کی تاریخ بھی کچھ زیادہ دور نہیں ہے مگر اس کے باوجود نہ سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دیتی ہے اور نہ یہ پسند کرتی ہے کہ کہیں کوئی ایسا اجتماع یا مظاہرہ برپا ہو جس سے نقص امن کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جہاں بے ہنگم اجتماع ہوگا وہاں ہڑبونگ مچنا اس کا منطقی نتیجہ ہے۔ لہٰذا ان خدشات کے پیش نظر جلسے جلوسوں کی قطعاً اجازت نہیں دی جا رہی جو بالکل درست پالیسی ہے۔ بنا بریں حکومت کو یہ باور کرنا چاہیے کہ محرم کا جلوس یقیناً فرقہ وارانہ کشیدگی کا باعث بنتا ہے۔ اور ہر سال حکومت اور سماجی ادارے امن کمیٹیاں قائم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اسی طرح "میلاد النبی ﷺ" کے جلوس پر ایک طرف تو حکومت سے ناراض عناصر اپنے بغض کے اظہار میں نعرہ بازی ہی نہیں باقاعدہ مظاہروں پر اتر آتے ہیں تو دوسری طرف جلوس کے کارکن ایک مخصوص مذہبی نقطہ نگاہ کے ساتھ اپنے مخالف مکاتب فکر پر طنز و تعریض ہی نہیں سب و شتم تک روا رکھتے ہیں۔ مگر جلوس کو مذہبی فریضے کی ادائیگی کا مظہر قرار دیئے رہتے ہیں — جشن آزادی کے جلوسوں میں بھی سیاسی مخالفین اپنی اپنی قوت نمائی اس رنگ میں کرتے ہیں کہ گویا وہی سب سے بڑے محب وطن بلکہ

(باقی صفحہ ۲۱ پر)

درس منتخبات قرآن
(قسط ۳)

ترتیب: پروفیسر عبداللہ شاہین

شَهَادَةً عَلَى النَّاسِ

ابن کثیر خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس پسندیدہ قبلے کی طرف تمہیں متوجہ کرنا اس لئے ہے کہ تم خود بھی پسندیدہ اُمت ہو۔ اور دوسری اُمتوں پر قیامت کے دن گواہ بنے رہو گے، کیونکہ وہ سب تمہاری فضیلت مانتے ہیں۔ مسند احمد کی ایک روایت میں ہے قیامت کے دن نبی آئیں گے اُن کی اُمت کو بلایا جائے گا اور اُن سے پوچھا جائے گا کہ کیا نبی نے تمہیں تبلیغ کی تھی؟ وہ انکار کریں گے نبی سے کہا جائے گا۔ تم نے تبلیغ کی؟ وہ کہیں گے ہاں۔ کہا جائے گا۔ تمہارا گواہ کون ہے؟ وہ کہیں گے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی اُمت۔ پس محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی اُمت بلائی جائے گی۔ اُن سے یہی سوال ہو گا کہ کیا اس پیغمبر نے تبلیغ کی؟ یہ کہیں گے ہاں۔ اُن سے کہا جائے گا کہ تمہیں کیسے علم ہوا؟ یہ جواب دیں گے کہ ہمارے پاس ہمارے نبی آئے اور آپ نے خبر دی کہ انبیاء نے تیرا پیغام اپنی اپنی اُمتوں کو پہنچایا۔ یہی مطلب ہے اللہ عزّ وجل کے اس فرمان وَكَذٰلِكَ ..... (الخ) کا۔

ضیاء القرآن قیامت کے روز جب اگلے پیغمبروں کی اُمتیں اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کریں گی کہ ہمیں کسی نے تیرا پیغام ہدایت نہیں پہنچایا تو اُس وقت اُمتِ مصطفیٰ گواہی دے گی کہ یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں۔ تیرے پیغمبروں نے تو تیرا پیغام حرف بحرف پہنچا دیا تھا۔ اور جب ان پر اعتراض ہو گا کہ تم اس وقت موجود ہی نہ تھے تم گواہ کیسے بن گئے؟ تو یہ جواب دیں گے کہ اے اللہ تیرے حبیب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں بتایا کہ تیرے رسولوں نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا۔ اور نبی کریمؐ اپنی اُمت کی صداقت و عدالت کی گواہی دیں گے کیونکہ حضورؐ اپنے اُمتیوں کے حالات سے پورے واقف ہیں۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیزؒ اپنی تفسیر فتح العزیز میں تحریر فرماتے ہیں۔ تمہارا رسول تم پر گواہی دے گا کیونکہ وہ جانتے ہیں اپنی نبوت کے نور سے اپنے دین کے ہر ماننے والے کے رتبے کو کہ میرے دین میں اس کا کیا درجہ ہے اور اس کے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟

تفہیم القرآن اس سے مراد یہ ہے کہ آخرت میں جب پوری نوعِ انسانی کا اکٹھا حساب لیا جائے گا۔ اُس وقت رسولؐ ہمارے ذمہ دار نمائندے کی حیثیت سے تم پر گواہی دے گا کہ فکرِ صحیح اور عملِ صالح اور نظامِ عدل کی جو تعلیم ہم نے اُسے دی تھی وہ اس نے تم کو بے کم و کاست پوری کی پوری پہنچا دی اور عملاً اس کے مطابق کام کر کے دکھا دیا۔ اس کے بعد رسولؐ کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے تم کو عام انسانوں پر گواہ کی حیثیت سے اٹھنا ہو گا اور یہ شہادت دینی ہو گی کہ رسولؐ نے جو کچھ تمہیں پہنچایا تھا وہ تم نے انہیں پہنچانے میں اپنی حد تک کوئی کوتاہی نہیں کی۔

حاصل مطالعہ:۔ اس آیت میں اُمتِ محمدیہ اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت علی الناس کا ذکر ہے۔ جس سے صاحبِ تفہیم القرآن نے اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے باعث دعوتِ حق اور قیامِ عدل مراد لیا ہے۔ لیکن اکثر مفسّرین نے احادیث کے حوالے سے یہ تصریح فرمائی ہے کہ اس سے مراد سابقہ نبیوں کے فریضۂ تبلیغ کے بارے میں دی جانے والی گواہی ہے۔

اُمتِ مسلمہ اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

دی ہوئی غیبی خبروں کے بل بوتے پر سابقہ انبیاء کی ادائیگی تبلیغ کی گواہی دے گی اور صادق و امین نبیؐ وحیِ الٰہی پہ مبنی اپنی ہی دی ہوئی اس خبر کی تصدیق کریں گے کہ سابقہ انبیاء نے اپنے اپنے دورِ رسالت میں حقِ تبلیغ ادا کر دیا تھا۔

تاہم ایک فاضل مفسرؒ نے تفسیر فتح العزیز کے حوالے سے یہ نکتہ وری کی ہے کہ حضورؐ کی گواہی اس بناء پر ہوگی کہ آپؐ اپنے امتیوں کے مقام و مرتبہ اور حقیقتِ ایمان سے آگاہ ہیں۔ ایسے ہی کچھ خیالات قرآنِ پاک کے بعض حواشی میں بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ صاحب "نور العرفان" نے اس آیت پہ یوں حاشیہ آرائی کی ہے: "معلوم ہوا کہ حضورؐ نے تمام انبیاءؑ کے حالات آنکھوں سے دیکھے ہیں اور اپنی امت کے ظاہر و باطن حال کا مشاہدہ فرما رہے ہیں" لیکن قرآنی آیات و واقعات سے ایسی موشگافیوں کا ابطال ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَا إِلَى مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ (قصص - ۴۴)

"اور جب ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف حکم بھیجا تو تم (اے نبیؐ طور کے) مغرب کی طرف نہیں تھے اور نہ اس واقعے کے دیکھنے والوں میں تھے۔"

صاحب "ضیاء القرآن" اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:-

"حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ جس صحت اور فصاحت سے آپؐ نے بیان کیا ہے اس کی وجہ نہیں کہ آپؐ اس وقت موجود تھے اور تمام حالات کا مشاہدہ کر رہے تھے بلکہ اس کا علم آپؐ کو وحی کے ذریعے بخشا گیا ہے۔"

اسی طرح سورۂ نور میں حضرت عائشہ صدیقہؓ طیبہ طاہرہ پر بہتان باندھے جانے کا ذکر ہے۔ یہ وہ نازک لمحہ تھا جب عظمت و عصمتِ نبویؐ کو تشویش لاحق تھی۔ حضرت عائشہؓ تقریباً ایک ماہ تک اشکبار ہو کر انگاروں پہ لوٹتی رہیں۔ خود سید المرسلینؐ انتہائی بے کل اور مضطرب رہے مگر آپؐ نے اپنی پیاری زوجہ کے بارے میں غایت درجہ حسنِ اعتماد رکھنے کے باوجود کسی قسم کی دو ٹوک گواہی نہ دی۔ دوسری طرف حضرت حسانؓ بن ثابت بھی سوءِ ظن رکھنے والوں میں شامل تھے۔ اس طرح ان کے ایمان کی کیفیت و کمیت پر زد پڑ سکتی تھی مگر آپؐ نے کسی کے ایمان کی دو ٹوک گواہی نہ دی۔ یہاں تک کہ دلوں کے بھید جاننے والے عالم الغیب رب نے بذریعہ وحی سورہ نور میں حضرت عائشہؓ کی پاکدامنی کی گواہی دی۔

ظاہر ہے کہ اگر آپؐ تمام حضرات کی حقیقتِ ایمان سے آگاہ اور ظاہر و باطن حال کا مشاہدہ فرمانے والے ہوتے تو فوراً حق کی گواہی دے کر معاملہ کو قطعی واضح فرما دیتے۔ بہر حال اس مضمون پر سورہ آل عمران - ۴۴۔ ہود - ۴۹ - یوسف ۳ - ۱۰۲ اور سورہ قصص - ۴۴ آیات کے تحت مزید روشنی ڈالی جائے گی۔ ان شاء اللہ۔

خریداروں کے لئے تبلیغی کتب

ادارہ الاعتصام کی طرف سے مفت تقسیم کی جانے والی تبلیغی کتب نئے خریداروں کو پہلی وی پی کے ساتھ ہی بھیج دی جاتی ہیں مگر پرانے خریداروں کے اکثر خطوط موصول ہوئے ہیں کہ ان کو بھی یہ کتب ارسال کی جائیں۔ ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ مبلغ پانچ روپے بطور ڈاک خرچ بذریعہ منی آرڈر یا ڈاک ٹکٹ کی صورت میں روانہ فرمائیں تاکہ ان کے آرڈر کی تعمیل ہو سکے۔ (مینیجر الاعتصام)

ضروری اعلان

۱۔ خبریں اور اعلانات مختصر بھیجیں۔
۲۔ تبلیغی رودادیں اور دیگر غیر ضروری تفصیلات شائع نہیں ہوں گی (۳) مضامین صاف اور خوش خط لکھیں۔ (۴) آیات و احادیث کے حوالے مکمل درج کریں۔ (ادارہ)

حافظ صلاح الدین یوسف

عورت کی نصف دِیت اور اس کی حکمت و مصلحت

۱۳ اکتوبر ۱۹۸۴ء کے "نوائے وقت" لاہور کے صفحہ اول پر عورت کی نصف دِیت کے مسئلے پر مولانا محمد حنیف ندوی کا ایک بیان شائع ہوا ہے۔ افسوس ہے کہ مولانائے محترم کی جلالتِ علمی کے باوجود اس سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے مختصراً مولانا کے خیالات پر گفتگو کی جاتی ہے۔ تاہم قبل اس کے کہ مولانا کے بیان پر کچھ عرض کیا جائے مسئلے کی نوعیت بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مسئلے کی نوعیت

مختصراً مسئلے کی نوعیت یہ ہے کہ بطورِ غلطی اگر کوئی عورت قتل ہو جائے تو اس کی دِیت مرد کی دیت سے نصف ہو گی۔ قتلِ عمد کا حکم اس سے مختلف ہے اور اس میں مرد و عورت کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے۔ یعنی صرف ایک صورت (قتلِ خطا) میں عورت کی دیت مرد کی دِیت سے آدھی ہو گی۔

شرعی دلائل

قتلِ خطا کی دِیت میں مرد و عورت کے درمیان یہ تفریق کیوں ہے؟ اس کی وجہ حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی دلیل تو وہ حدیث ہے جو سنن نسائی وغیرہ میں آتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ثلث تک مرد و عورت کی دِیت برابر ہے اور اس کے بعد عورت کی دِیت نصف ہے۔ سنداً یہ روایت بالکل صحیح ہے (دیکھئے سنن نسائی کتاب القَوَد باب عقل المرأۃ)

۲۔ سنن کبریٰ بیہقی کی دوسری روایت ہے جس میں آتا ہے کہ عورت کی دِیت مرد کی دِیت کا نصف ہے (کتاب الدیات، باب دیۃ المرأۃ، ص ۹۵، ج ۸) اس روایت میں قدرے ضعف ہے۔ لیکن دو وجوہ سے ضعف کے باوجود یہ حدیث قابلِ استدلال ہے۔

ایک تو اس وجہ سے کہ مسئلے کی بنیاد صرف یہ حدیث ہی نہیں ہے بلکہ اصل بنیاد تو وہ حدیث ہے جو سنن نسائی میں آتی ہے۔ اسی طرح حضرت عمرو بن حزم کی روایت میں بھی بقول بعض فقہاء اس کا ذکر ہے۔ اور عمرو بن حزم کی اس روایت کو ماہرینِ فنِ حدیث نے صحیح قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو التعلیقات السلفیہ علی سنن النسائی، ج ۲، ص ۲۴۷) اور اصولِ حدیث کے مطابق وہ ضعیف روایت قابلِ قبول ہوتی ہے جس سے کسی صحیح حدیث کی تائید ہوتی ہو۔ محدثین ایسی روایات کو بطور توابع اور شواہد کے ذکر کرتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جس روایت کو اُمّت کے علماء و فقہاء کا تلقی بالقبول حاصل ہو جائے وہ روایت بھی قابلِ استدلال ہوتی ہے اس کے ضُعف کا جبر تلقی بالقبول کی وجہ سے ہو جاتا ہے۔

۳۔ تیسرے آثارِ صحابہ اور خلفائے راشدین کے فیصلے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

۴۔ چوتھے اس مسئلے پر اُمتِ مسلمہ کے عُلماء و فقہاء کا اجماع چلا آ رہا ہے۔ اور اجماعِ اُمت بھی دین میں حجت ہے۔ صرف دو شخصوں (ابوبکر الاصم اور ابن علیہ) کا اختلاف منقول ہے جسے فقہاء نے شاذ قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو۔ المغنی ابن قدامہ ج ۹۔ ص ۵۳۲)

یہ دو شخص کون ہیں؟ امام ابن قدامہ مقدسی نے المغنی میں صرف الاصم اور ابن علیہ نام لکھا ہے۔ الاصم سے اگر مراد ابوبکر الاصم ہے جیسا کہ زیادہ صحیح یہی نام معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ الاصم کے نام سے یہی معروف ہیں۔ جیسا کہ حافظ ذہبی رو

"سیر اعلام النبلاء" میں "الاصم" کے عنوان کے تحت ابوبکر الاصم
کا ترجمہ درج کیا ہے اور اسے "شیخ المعتزلہ" کہا ہے (ج ۹ ص ۴۰۲)
اور لسان المیزان میں اس کا نام عبدالرحمن بن کیسان بتلایا گیا ہے اور
اسے معتزلی اور ایک عجیب و غریب تفسیر کا مصنف کہا ہے۔
ج ۳۔ ص ۴۲۷)

۲۔ ابن علیہ کے نام سے دو شخص معروف ہیں۔ اسمٰعیل بن علیہ
اور ابراہیم بن علیہ۔ بالترتیب یہ دونوں باپ بیٹے ہیں تاہم باپ
(اول الذکر) کا شمار محدثین میں ہوتا ہے۔ البتہ ان کے بیٹے ابراہیم
بن علیہ کا اصحاب تراجم نے اچھے انداز میں ذکر نہیں کیا ہے علاوہ ازیں
اسے ابوبکر الاصم کے غلمان (غلام اور شاگرد) میں سے قرار دیا ہے۔
امام شافعیؒ نے اس کے بارے میں یہاں تک کہا ہے ضالٌ مضلٌ
یضلُّ الناس "خود بھی گمراہ اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے والا"
ملاحظہ ہو "تاریخ بغداد للخطیب۔ ج ۶۔ ص ۲۰ - ۲۲)

ایسے دو شخصوں کی رائے سے جن کی امت میں کوئی علمی
حیثیت نہیں، اجماع کا دعویٰ کیوں کر مجروح ہو سکتا ہے؟

حکمت و مصلحت

یہ تو ہیں مسئلہ زیر بحث کے شرعی
دلائل۔ اب اس کی حکمت و مصلحت
بھی ملاحظہ فرمائی جائے۔

جہاں تک انسانی شرف و تکریم کا معاملہ ہے، اسلام میں
مرد و عورت کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے۔ اسلام ہی وہ پہلا
مذہب ہے جس نے انسانی معاشرے میں عورت کی عزت اور
اس کے مقام و منصب کا تحفظ اور اس کی قدر و منزلت کا
اعتراف کیا ہے (جس کی تفصیل کی گنجائش یہاں نہیں) لیکن
اس کے ساتھ یہ واقعہ بھی ہے کہ اسلام اس مساوات مرد و زن
کا قائل نہیں ہے جو اس وقت مغرب میں عام ہے۔ اسی لئے
تکریم نسوانیت کا مفہوم دونوں جگہ یکساں نہیں ہے۔ مغرب کے
نزدیک جو چیز عین تکریم نسوانیت ہے اسلام کے نزدیک وہ
عین تذلیل نسوانیت ہے۔ اسی طرح اسلام میں تکریم نسوانیت
کے لئے جو حدود و ضوابط تجویز کئے گئے ہیں، ہو سکتا ہے وہ مغرب کے
نزدیک استخفاف نسوانیت کا باعث ہوں۔

اسلام میں عورت کے لئے پردہ انتہائی ضروری ہے،
مرد و زن کے بے محابا اختلاط کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔
مغربی ذہن اسلام کی اس ہدایت پر ناک بھوں چڑھاتا ہے اور
اسے (نعوذ باللہ) عورت کی تذلیل قرار دیتا ہے لیکن اسلام
کی نظر میں یہ عورت کی تذلیل نہیں، اس کی عین عزت ہے اور
بے پردگی میں، جسے مغربی ذہن عورت کی عزت قرار دیتا ہے،
عورت کی تذلیل و تحقیر ہے۔

اسی طرح اسلام نے مرد و عورت کی مختلف فطری
صلاحیتوں کی بنا پر دونوں کا دائرہ کار بھی مختلف رکھا ہے۔ مرد
کو معاشی ذمہ داریوں کا کفیل بنایا ہے اور عورت کو اس معاشی
کفالت سے آزاد رکھا ہے۔ یہ صرف مرد کی ذمہ داری ہے کہ
وہ گھر سے باہر محنت مزدوری کرے، کارخانوں اور دفتروں
میں ملازمت کرے اور معاشی تگ و دو میں حصہ لے۔ اور
عورت گھر کی چار دیواری کے اندر امور خانہ داری کے فرائض
انجام دے۔ یہ الگ الگ دائرہ کار ان فطری صلاحیتوں کے
مطابق ہے جن کی وجہ سے مرد و عورت کی تخلیق ہوئی ہے اور
اسی میں ان کی عزت و تکریم ہے۔

اسی بنیاد پر میراث میں عورت کا حصہ مرد کے مقابلے
میں نصف ہے کیونکہ معاشی کفالت کے لئے مرد کو مال و
دولت کی حقیقی ضرورت ہے عورت کو نہیں۔ اسلام کا یہ
اصول قیامت تک کے لئے ہے، اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش
نہیں۔ اب چاہے معاملہ کتنا ہی برعکس ہو جائے اور عورتیں
مردوں کے دوش بدوش معاشی دوڑ میں خواہ کتنی ہی سرگرمی سے
حصہ لیں اور کارخانے اور دفاتر چاہے عورتوں کے دم قدم
سے کتنے ہی پر رونق ہو جائیں لیکن میراث میں عورت کا حصہ
پھر بھی مرد کے حصے سے نصف ہی رہے گا کیونکہ معاشی
سرگرمیوں میں عورتوں کی (بطور اصول) شرکت ہی سرے سے
غلط ہے اور اسلام کے خلاف ہے (بعض انفرادی صورتوں میں

بطور مجبوری عورتوں کی ملازمت الگ بات ہے، جس کی گنجائش محدود دائرے میں موجود ہے)

عورت کی نصف دیت میں بھی وہی علت ہے جو میراث کے نصف حصے میں ہے یعنی چونکہ مرد کے قتل کئے جانے کی صورت میں ایک پورا خاندان اپنے کفیل سے محروم ہو جاتا ہے، اس لئے خاندان کی کفالت کے نقطۂ نظر سے اس کی پوری دیت ضروری ہے، جب کہ عورت کے قتل کئے جانے کی صورت میں ایسی مالی مشکل پیش نہیں آتی۔ اس لئے اس کی نصف دیت قطعاً غیر معقول نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں نصف دیت کے پیچھے قطعاً یہ جذبہ کارفرما نہیں ہے کہ نعوذ باللہ عورت حقیر ہے یا وہ نصف انسان ہے۔ اس لئے اس کی دیت بھی نصف ہے بلکہ اس میں مضمر وہی علت یا حکمت و مصلحت ہے جو میراث میں پائی جاتی ہے جس میں عورت کی تحقیر کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

مولانا ندوی کے دلائل کا تجزیہ

مولانا ندوی صاحب نے فرمایا ہے کہ عورت بھی پورا انسان ہے۔ اس لئے اس کی دیت بھی پوری ہونی چاہیئے۔ نصف نہیں ہو سکتی لیکن مسئلہ پورے انسان یا نصف انسان کا سرے سے ہے ہی نہیں کیونکہ "جان" کا بدلہ تو ہے نہیں بلکہ اس معاوضہ کا ہے جو عاقلہ نے ورثاء کو ادا کرنا ہے۔ نصف دیت کے ڈانڈے عورت کی انسانیت سے ملانا ایک تو خلطِ مبحث ہے۔ دوسرے، جذباتی اندازِ فکر ہے جس سے مقصود عورتوں کی حمایت حاصل کرنا ہے۔ اور تیسرے، اگر "پورا انسان" والی دلیل دیت کے مسئلے میں کوئی معقولیت رکھتی ہے تو اس "دلیل" کی رو سے تو عورت کا حصۂ میراث بھی مرد کے برابر ہی ہونا چاہیئے نہ کہ نصف۔ کیا اس "دلیل" کو صحیح تسلیم کر لینے کے بعد عورت کی نصف میراث کا کوئی جواز باقی رہ سکتا ہے۔؟

۲۔ دوسری بات مولانائے محترم نے یہ فرمائی ہے کہ عمرو بن حزم کی وساطت سے محدثین تک پہنچنے والی حدیث صحیح نہیں ہے۔ یہ بھی محلِ نظر ہے، علمائے محققین نے اس سند کی تحقیق کر کے اسے صحیح قرار دیا ہے (ملاحظہ ہو مصری فاضل احمد شاکر کی تحقیق بحاشیہ "المحلّی" ج ۱، ص ۸۲ - ج ۵، ص ۲۱۴ - ج ۶، ص ۳۶ اور ۱۶۶) تا
یہ بات ضرور ہے کہ بعض شافعی اور حنبلی فقہاء نے عمرو بن حزم کی روایت کے حوالے سے جو یہ لکھا ہے کہ "عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے" حدیث کی متداول کتب میں حضرت عمرو بن حزم کی روایت کے کسی طریقے میں یہ الفاظ موجود نہیں ہیں لیکن نصف دیت کے قائلین کی بنائے استدلال یہ ٹکڑا نہیں بلکہ سنن نسائی کی وہ صحیح روایت ہے جو مضمون کے آغاز میں نقل کی جا چکی ہے۔ دوسری سنن کبریٰ بیہقی میں، حضرت معاذ بن جبل سے مروی حدیث ہے۔ تیسرے خلفائے راشدین کے فیصلے اور آثارِ صحابہ ہیں اور چوتھے نمبر پر فقہائے امت کا اجماع ہے۔ اس لئے عمرو بن حزم کی روایت میں نصف دیت والا ٹکڑا اگر موجودہ کتب حدیث میں نہیں ملتا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۳۔ تیسری بات مولانا نے یہ فرمائی ہے کہ حدیث رسول سے قرآن کے عموم میں تخصیص اس وقت جائز ہے جب کہ خاص حکم میں اس عام آیت سے بڑھ کر زیادہ حکمت، زیادہ مصلحت اور زیادہ دانائی پائی جائے۔ لیکن اس سلسلے میں پہلا سوال تو یہ ہے کہ یہ اصول کس نے بیان کیا ہے؟ اور اس کی بنیاد کیا ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ خود ساختہ حکمت و مصلحت کی بنیاد پر اگر عموماتِ قرآن میں تخصیص کو جائز تسلیم کر لیا گیا تو کیا اس سے احکامِ قرآن میں تبدیلی کا لامتناہی سلسلہ شروع نہیں ہو جائے گا؟ اس لئے ہمارے خیال میں عمومِ قرآن کی تخصیص کے لئے مولانائے محترم نے جو اصول بیان فرمایا ہے وہ صحیح نہیں۔ عمومِ قرآن کی تخصیص کے لئے شرعی دلائل ضروری ہیں۔ اگر شرعی دلائل سے قرآن کے کسی عموم کی تخصیص، کسی اجمال کی تفصیل اور کسی اطلاق کی تقیید ہوتی ہے تو وہ قابلِ تسلیم ہے۔ وہاں حکمت و مصلحت کی کمی بیشی کا موازنہ تو کجا، سرے سے حکمت و مصلحت سمجھ میں نہ آئے، تب بھی دلائلِ شرعیہ پر مبنی تخصیص

انکار کی گنجائش نہیں ہے اور دلائلِ شرعیہ میں سب سے اہم دلیلِ شرعی حدیثِ نبوی ہی ہے۔ حدیثِ نبوی سے بالخصوص جبکہ اس کے ساتھ آثارِ صحابہ اور اجماعِ امت بھی ہو، عمومِ قرآن کی تخصیص بالکل صحیح ہے۔

دراصل عمومِ قرآن کی تخصیص کا مسئلہ صدیوں سے مزلۃ الاقدام کا باعث چلا آ رہا ہے اور ہمیشہ لوگوں نے اسے اپنے ذہنی مفروضات یا فقہی تعصبات کی روشنی میں دیکھا ہے۔ اور اس سادے اصول کو ہمیشہ نظر انداز کیا ہے جو فکرِ محدثین پر مبنی ہے۔ جس کی وضاحت ابھی کی گئی ہے۔ کسی نے اپنے فقہی جمود کو برقرار رکھنے کے لئے کہا کہ خبرِ واحد سے عمومِ قرآن کی تخصیص جائز نہیں لیکن جب کوئی اپنی ہی فقہی ضرورت پیش آئی تو حدیثِ ضعیف تک سے قرآنی عموم کی تخصیص کر ڈالی۔ کسی نے اپنے ذہنی مفروضات کے جوشِ اثبات میں خبرِ متواتر کو بھی خبرِ واحد باور کرانا چاہا تاکہ خبرِ متواتر سے ثابت شدہ اس تخصیصِ قرآنی کا انکار کیا جا سکے۔ جو اس کے ذہنی مفروضے کے خلاف ہے۔ جیسا کہ حدِ رجم کے ضمن میں بعض "تدبر پسند" مفسرین نے کیا ہے۔ اسی طرح نصف دیت کی تخصیص سے جان چھڑانے کے لئے اب ایک نیا فلسفہ یہ تراشا گیا ہے کہ پہلے حکمت و مصلحت کی پیمائش کی جائے اور پھر دیکھا جائے کہ حکمت و مصلحت تخصیص میں زیادہ ہے یا تعمیم میں؟ لیکن اگر اس اصول کی صداقت تسلیم کر لی گئی تو پھر بات نصف دیت تک ہی محدود نہیں رہے گی بلکہ اس کی زد میں بہت سے نصوصِ قرآنی بھی آ جائیں گے۔

۴۔ آخر میں مولانائے محترم نے علمائے کرام سے اپیل کی ہے کہ وہ عورتوں کے بارے میں "حرفیت پسندی" سے الگ ہو کر عورتوں کے حقوق و فرائض کے مسئلے کو وسیع تر انسانی بنیادوں پر حل کریں۔ ورنہ خطرہ ہے کہ ان کے طرزِ عمل سے عورتوں کے دلوں میں اسلام کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں۔

مولانا کا یہ بیان غلطی ہائے مضامین کا آئینہ دار ہے۔ اس میں :۔

اولاً علمائے کرام کو علم و فہم سے عاری اور حکمت و دانش سے بے بہرہ باور کرایا گیا ہے۔

ثانیاً عورتوں کے حقوق و فرائض کو محلِ طلب بتلایا گیا ہے۔

ثالثاً حرفیت پسندی سے الگ ہو کر سوچنے کی دعوت دے کر نصوصِ شریعت میں تبدیلی کی گنجائش نکالی گئی ہے۔

رابعاً عورتوں کے اندر غلط جذبات کی آبیاری کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہمارے خیال میں یہ سب باتیں مولانا کے علمی مقام سے فروتر ہیں۔ کاش وہ ایسی باتیں کرنے سے پہلے سوچ لیتے۔ چند علماء کے علم و فہم کو تو متہم کیا جا سکتا ہے، انہیں حکمت و دانش سے بے بہرہ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے لیکن جہاں مسئلہ اجماعِ امت کا ہو یعنی اقلیت و اکثریت سے قطع نظر پوری امت کے علماء و فقہاء کا ہو، وہاں یہ بحث جچتی نہیں۔ یہاں پوری امت کے فقہاء کو بے دانش سمجھنے کی بجائے اگر آج کل کے چند متجددین کی دانش افرنگی کو ہی در خورِ اعتناء نہ سمجھا جائے تو زیادہ بہتر اور احوط و اسلم ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے۔ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَجْمَعُ أُمَّتِي عَلَىٰ ضَلَالَةٍ (جامع ترمذی، کتاب الفتن، باب ماجاء فی لزوم الجماعۃ) یعنی "میری امت کو اللہ تعالیٰ کسی گمراہی پر جمع نہیں کرے گا"۔

۲۔ عورتوں کے حقوق و فرائض بھی آج سے چودہ سو سال پہلے متعین کر دیئے گئے ہیں اور آج بھی جب تک عورت کو ان حقوق و فرائض کا پابند نہیں بنایا جائے گا، اصلاحِ احوال کی کوئی صورت نہیں۔ اس لئے مسئلہ عورتوں کے حقوق و فرائض کا حل کرنا نہیں ہے بلکہ اسے اس کے فرائض کا پابند بنانا اور اس کے مطابق عمل در آمد کرانا ہے۔

۳۔ حرفیت پسندی سے الگ ہو کر سوچنے کی دعوت دینا انتہائی گمراہی کا راستہ ہے۔ ایسے ہی لوگوں نے یہاں تک

کہہ دیا ہے کہ عورت کو نصف میراث کی بجائے مرد کے مساوی حصہ ملنا چاہیئے۔ ایسے "اجتہاد" کے مقابلے وہ "حرفیت پسندی" قابلِ تعریف ہے جس میں نصوصِ شریعت سے انحراف نہ ہو۔

۴۔ جہاں تک اس اندیشے کا تعلق ہے کہ عورت کی نصف دیّت پر اصرار کرنے کی وجہ سے عورتوں کے اندر اسلام کے خلاف شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں گے تو یہ بات بھی غلط ہے کیونکہ چودہ سو سال سے اسلام میں عورت کا حصۂ میراث مرد کے حصۂ میراث سے نصف چلا آ رہا ہے۔ نصف دیّت میں تو سرے سے عورت کی کوئی حق تلفی ہی نہیں ہے۔ خطاً عورت کے قتل کر دیئے جانے کی صورت میں جو دیّت ورثاء کو ملے گی، وہ اس کے والدین، بھائی یا خاوند وغیرہ ہی ہوں گے۔ عورت کا اس میں کیا نقصان ہے؟ یا اس کی بے حرمتی کا اس میں کیا پہلو ہے؟ اگر عورتوں کے اندر شکوک و شبہات پیدا ہو سکتے ہیں تو مسئلہ میراث کی وجہ سے ہو سکتے ہیں مسئلہ دیّت کی وجہ سے نہیں۔ اور الحمد للہ مسلمان عورت کے اندر مسئلہ میراث کی وجہ سے آج تک اسلام کے خلاف شکوک و شبہات پیدا نہیں ہوئے۔ کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ اس میں جو حکمت و مصلحت ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ اب اگر کسی "انگریزی خواں" عورت کے اندر ایسے شبہات پیدا ہوتے ہیں تو جو جواب مسئلہ میراث کے سلسلے میں دیا جائے گا۔ نصف دیت کے سلسلے میں پیدا ہونے والے شبہے کا جواب بھی وہی ہو گا۔

ایک اشکال کا حل

مولانا کے خیالات پر ہم نے ضروری نقد کر دیا ہے تاہم گزشتہ بحث سے یہ اشکال پیدا ہو سکتا ہے کہ تم نے نصف دیّت کی حکمت و مصلحت یہ بیان کی ہے کہ چونکہ معاشی کفالت مرد کی ذمّے داری ہے عورت کی نہیں، اس لئے عورت کے قتل کئے جانے کی صورت میں خاندان اپنے کفیل سے محروم نہیں ہوتا۔ لیکن آج کل عورتیں بھی مردوں کی طرح معاشی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں۔ اس لئے نصف دیّت والی حکمت میں کوئی وزن باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا اب عورت کی دیت بھی مرد کے دیت کے برابر ہونی چاہیئے۔

اس سلسلے میں پہلی گزارش تو یہ ہے کہ عورتوں کا مردوں کے دوش بدوش معاشی تگ و دو میں شریک ہونا صریحًا اسلام کے خلاف ہے۔ اسلام اس کو قطعًا پسند نہیں کرتا۔ اس لئے ایک خلافِ اسلام اقدام کی وجہ سے اسلام اپنے ایک مسلّمہ اصول میں تبدیلی کیونکر گوارا کر سکتا ہے۔؟

ثانیًا عورتوں کی اکثریت ملازمت شوق کے طور پر کرتی ہے۔ وہ اپنی معاشی ذمّے داریوں کی وجہ سے ملازمت کرنے پر مجبور نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملازمت پیشہ خواتین کی اکثریت اُونچی سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہے، جن کے پاس دولت کی چہل پہل ہے اور وسائلِ زندگی کی فراوانی ہے۔ ان عورتوں کی آمدنیاں خاندان کی کفالت نہیں کرتیں بلکہ ان کی آمدنی کا بیشتر حصہ ان کے نت نئے فیشنوں، بیش قیمت ملبوسات، سامانِ آرائش و زیبائش اور اسی قسم کے اللّوں تللّوں پر خرچ ہوتا ہے۔ اور یہ ساری چیزیں معاشرے میں فساد اور بگاڑ کا باعث ہیں۔ اسلام اس کی حوصلہ افزائی کیونکر کر سکتا ہے؟۔

ثالثًا۔ عورتوں کا ایک حصہ ضرور ایسا ہے کہ فی الواقع وہ معاشی مجبوریوں کی وجہ سے ملازمت کرتا ہے اور وہ عورتیں اپنے خاندان کی کفیل ہیں۔ ایسی عورتوں کے بارے میں قاضی کو یہ اختیار دیا جا سکتا ہے کہ وہ نصف دیّت کے علاوہ (حالات و ضروریات کے مطابق) مزید رقم بطور جرمانہ قاتل سے وصول کر کے اُس خاندان کی دادرسی کرے جو اپنے کفیل سے محروم ہو گیا ہے۔ لیکن اسلام کا یہ اصول اپنی جگہ ناقابلِ تغیّر ہے کہ چونکہ عورت معاشی ذمّہ داریوں سے آزاد ہے اس لئے میراث اور دیّت میں وہ مرد کے مساوی نہیں۔ اور اسلام کا یہ اصول عورت کی تحقیر پر مبنی نہیں بلکہ اُس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے جس کی وضاحت گزشتہ سطور میں کی گئی ہے۔

علمائے کرام کے بارے میں ایک غلط تاثر

علاوہ ازیں

علمائے کرام کو عورتوں سے کوئی کد نہیں ہے کہ ان کے بارے میں یہ تاثر صحیح ہو کہ وہ عورتوں کے معاشرتی رتبے کو گھٹانا چاہتے ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ عورتوں کو مردوں کے دوش بدوش لانا چاہتے ہیں اور کامل مساواتِ مرد و زن کے قائل ہیں۔ علمائے کرام پورے اخلاص اور دردمندی سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ راستہ سراسر اسلام کے خلاف ہی نہیں بلکہ عورت کی اس عظمت و شرافت کے بھی منافی ہے جو اسلام کی رُو سے اسے حاصل ہے۔ اسلام نے عورت کو گھر کی ملکہ بنایا ہے۔ مغربی ذہن نے اسے معاش کا کل پرزہ بنا دیا ہے۔ اسلام نے عورت کو چراغِ خانہ بنایا ہے۔ مغرب نے اسے شمعِ محفل بنا دیا ہے۔ اسلام نے عورت کو صرف خاوند کا خدمت گزار بنایا ہے لیکن مغرب نے اسے "ائیر ہوسٹس" کی صورت میں "ریسپشن گرل" کی صورت میں "ماڈل گرل" کی صورت میں اور "ایکٹریس" کی صورت میں ہر ہوس ران کا خدمت گزار بنا دیا ہے ؎

ببیں تفاوتِ راہ از کجا است تا بہ کجا

علماء کے نزدیک عورت کی عزت گھر کی ملکہ، چراغِ خانہ اور صرف خاوند کی خدمت گزار ہونے کی صورت میں ہی ہے۔ اور عورت معاشی دوڑ میں جس راہ پر چل نکلی ہے، وہ قطعاً اس کی عزت کا راستہ نہیں بلکہ اس میں اس کی تحقیر ہی نہیں اسلام سے ایک گونہ بغاوت بھی ہے۔ علمائے کرام عورتوں کے اس باغیانہ رجحان اور غیر فطری طرزِ عمل کی حمایت کیونکر کر سکتے ہیں؟

مولانا امین احسن اصلاحی کے خیالات

"نوائے وقت" کے محولہ مضمون میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے خیالات بھی شائع ہوئے ہیں۔ اس میں انہوں نے اگرچہ اپنی حتمی رائے دینے سے اس لئے گریز کیا ہے کہ اس مسئلے میں انہوں نے ابھی تحقیق نہیں کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ نصف دیت کے قائلین کے پاس قرآن و سنت سے کوئی دلیل نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں مولانا اصلاحی صاحب تضادِ فکری کا شکار ہیں۔ ایک طرف تو وہ فرماتے ہیں کہ مسئلہ زیرِ بحث میں ان کی تحقیق نہیں ہے۔ دوسری طرف کہتے ہیں کہ علماء کے پاس دلیل کوئی نہیں ہے۔ صرف بعض شخصیتوں کے اقوال ہیں۔ مولانا سے پوچھا جا سکتا ہے کہ جب آپ نے تحقیق ہی نہیں فرمائی ہے تو دوسرے فریق کے دلائل کی نفی آپ نے کس بنیاد پر کی ہے۔؟

دوسری بات یہ ہے کہ مولانا اصلاحی صاحب معروف معنوں میں اگرچہ منکرِ حدیث نہیں ہیں لیکن ان کی بنیادی فکر انکارِ سنت پر ہی مبنی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی اس مخصوص فکر کی بنیاد پر رجم محصَن کی ان احادیث کو تسلیم نہیں کرتے جو تمام کتبِ حدیث میں صحیح سندوں کے ساتھ مروی ہیں اور حدِ تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں۔ اس لئے اگر وہ نصف دیت کی احادیث کو نہیں مانتے تو کوئی مستبعد امر نہیں۔ جب ایک شخص متواتر احادیث کا منکر ہے تو اس سے دوسری احادیث کے تسلیم کئے جانے کی امید کیونکر کی جا سکتی ہے۔؟

بہر حال مولانا اپنے فکری تضاد اور مخصوص نقطۂ نظر کی وجہ سے اہلِ سنت کے مسلک و عقیدے سے بہت دُور ہو گئے ہیں۔ اس لئے اب ان کی رائے اہلِ سنت کے علمی حلقوں میں کسی اہمیت کی حامل نہیں۔ مولانا کے تضادِ فکر کی ایک عجیب و غریب مثال یہ بھی ہے کہ وہ اجماعِ صحابہؓ اور اجماعِ اُمت کو تسلیم تو کرتے ہیں اور اس سے خروج کو جائز نہیں سمجھتے بلکہ مذاہبِ اربعہ کا کسی مسئلے پر اتفاق بھی ان کے نزدیک دین میں حجت ہے جس کے خلاف ان کے نزدیک جائز نہیں۔ لیکن وہ حدِ رجم کے مسئلے میں اجماعِ صحابہ، اجماعِ امت، اور اجماعِ مذاہبِ اربعہ کو بھی مسترد کر چکے ہیں۔ اب اگر نصف دیت کے مسئلے میں بھی وہ اجماعِ اُمت کا انکار کرتے ہیں تو بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ؎

یک نہ شد دو شد

مولانا عبدالغفار حسن حفظہ اللہ

(قسط ۲ آخری)

اسلامی ریاست اور جماعت سازی

آج کل پارٹیاں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے نام سے بٹی ہوئی ہیں۔ جمہوریت کا خاصا یہی ہے کہ ملک کے باشندے جنگ و جدال اور فساد و عناد کے نشہ میں مدہوش رہیں۔ حالانکہ اللہ تعالے کا حکم ہے کہ اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْہِ (سورۃ الشوریٰ آیت ۱۳ پارہ ۲۵) یعنی "تمام انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد یہی رہا کہ دین قائم کرو اور فرقہ بندی سے بچو" اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ اقامتِ دین کا کام فرقہ وارانہ ذہنیت اور دھڑے بندیوں کے ساتھ نہیں ہو سکتا، آج کل صورتِ حال یہ ہے کہ ہر ذہین یا متحرک آدمی ملک و ملت یا دین و مذہب کے نام پر کوئی جماعت یا گروپ قائم کر لیتا ہے۔ اس قسم کی جماعت سازی اور پارٹی بازی کی ذہنیت نے اُمت کو مزید انتشار و افتراق میں اُلجھا دیا ہے۔

شیطان کی ازل سے خواہش یہی ہے کہ آدم علیہ السلام کی اولاد ہر وقت لڑتی جھگڑتی رہے اور ان میں کبھی بھی اتحاد و اتفاق کی شکل پیدا نہ ہو۔ جیسا کہ حدیث میں ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اِنَّ الشَّیْطَانَ قَدْ اَیِسَ مِنْ اَنْ یَّعْبُدَہُ الْمُصَلُّوْنَ فِیْ جَزِیْرَۃِ الْعَرَبِ وَلٰکِنْ فِی التَّحْرِیْشِ بَیْنَھُمْ (مشکوٰۃ المصابیح کتاب الایمان۔ باب الوسوسہ۔ حدیث ۷۲ صفحہ ۲۷ طبع بیروت بحوالہ صحیح مسلم) یعنی "شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ جزیرہ عرب کے نمازی مسلمان اس کی پرستش کریں۔ ہاں ان کو آپس میں لڑانے کی توقع رکھتا ہے" بلکہ عملاً وہ اس کام میں لگا رہتا ہے۔ جماعتی تعصُّب اور فرقہ وارانہ تنگ نظری کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان صرف اپنے گروہ کو حق پر سمجھتا ہے اور دوسروں کو باطل پرست قرار دیتا ہے۔ روزانہ کافر، مشرک اور گستاخ کے القاب سے ایک دوسرے کو نوازا جاتا ہے۔ کہیں سیاسی زبان میں وطن سے غداری اور ملّت فروشی کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ یہی وہ غرور و نخوت اور جاہلی عصبیت ہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

"کہ اللہ تعالے نے میری طرف وحی کی ہے کہ مسلمان آپس میں تواضع سے کام لیں۔ کوئی کسی پر فخر و نخوت کا اظہار نہ کرے اور نہ کوئی کسی پر ظلم و زیادتی کرے" (مشکوٰۃ۔ کتاب الادب۔ باب المفاخرہ، حدیث نمبر ۴۸۹۸، صفحہ نمبر ۵۹۲) دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ عصبیت کس چیز کا نام ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ اَنْ تُعِیْنَ قَوْمَکَ عَلَی الظُّلْمِ (یعنی تو ظلم پر اپنی قوم کی مدد کرے" (مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد) ایک اور روایت میں ہے کہ حُبُّکَ الشَّیْءَ یُعْمِیْ وَیُصِمُّ یعنی "کسی شئی کی محبت انسان کو اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے" (مشکوٰۃ کتاب الآداب، باب المفاخرۃ، بحوالہ ابوداؤد)

آج کل کے نظام جمہوری میں ملک کے باشندے یا ان کے نمائندے کم سے کم دو دھڑوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ نمبر ۱، حزب اقتدار نمبر ۲۔ حزب اختلاف۔ حالانکہ اسلام اس طرح کی تقسیم کا قطعاً روادار نہیں ہے۔ یہ دونوں گروہ اپنی اپنی پارٹی کی عصبیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اُن کی پارٹی کا آدمی

کیسی ہی غلط بات کہے ۔ اور کیسا ہی بُرا فعل انجام دے اس کی
ت کی جائے گی۔ یا کم از کم اس سے چشم پوشی برتی جائے گی۔
کے برعکس مخالف پارٹی کی جانب سے خواہ کیسی ہی مفید تجویز
کی جائے اس کی مخالفت کی جائے گی یا کم از کم اس کی
د و حمایت میں جوش اور سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کیا جائے گا۔
وہ دور کی فرقہ وارانہ دھڑے بندیاں اور سیاسی برتری کے لئے
ٹی بازی قرآن و سنت کی تصریحات کے یکسر خلاف ہیں
ی آیات سابقہ صفحات میں پیش کی جا چکی ہیں ۔ اب چند
دیث بیان کی جاتی ہیں۔

(۱) تَرَى الْمُؤْمِنِينَ فِي تَرَاحُمِهِمْ ... الخ
"تم مسلمانوں کو آپس میں محبت و شفقت کے لحاظ سے ایک
کی طرح دیکھو گے ۔ اگر جسم کا ایک عضو درد محسوس کرتا ہے تو
جسم سراپا درد بن جاتا ہے" (مشکوٰۃ باب الشفقۃ
رحمۃ علی الخلق ۔ بحوالہ صحیح مسلم)

(۲) ایک مومن دوسرے مومن کے لئے عمارت کی طرح
وہ ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہیں (مشکوٰۃ حوالہ مذکورہ ۔
بخاری و مسلم) صحابہ کرام مجلس شوریٰ میں کھلے دل سے بیٹھتے
، جو تجویز ان کے نزدیک دلیل کے لحاظ سے قوی ہوتی اس کی
کرتے ۔ اور جو اس کے برعکس ہوتی اس کے بارے میں اختلاف
ظہار کرتے ۔ ان کے درمیان پارٹی بازی اور دھڑے بازی کا
ی وجود ہی نہ تھا ۔ مہاجر و انصار سب شیر و شکر تھے ، مہاجرین
نصار آج کل کی طرح سیاسی پارٹیوں میں بٹے ہوئے نہ تھے ۔
ہاجر اور انصار کے القاب وصفی نام تھے جو ان کو ان کے عمل
بنا پر قرآن مجید میں دیئے گئے تھے ۔ ہاں جب خلافت راشدہ
آخری دور میں سیاسی تقاضوں نے شدت اختیار کی تو سب
سے پہلے خوارج کے ظہور سے امت میں انتشار رونما ہوا اور پھر یہ
عا ہی چلا گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ پاکستان میں وحدت امت کے
صور کو اجاگر کرنے اور فرقہ بندی اور سیاسی پارٹی بازی کو ختم
کرنے کی ضرورت ہے ۔ اگر یہ شر فوری طور پر ختم نہیں ہو سکتا تو
کم از کم اس کی حوصلہ افزائی بھی نہ کی جائے ورنہ شدید خطرہ ہے کہ
انتخابات کی صورت میں گروہی عصبیت کو مزید تقویت حاصل
ہوگی اور باہمی فساد و عناد میں مزید اضافہ ہوگا ۔ میں اپنے مطالعے
اور تجربے کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ الیکشن کا موجودہ طریقہ اسلامی
مزاج کے یکسر خلاف ہے ۔ اگر انتخابات ملکی مصالح کے لحاظ سے
ضروری سمجھے جائیں تو انتخابات کے نظام کو غلط عناصر سے پاک
کرنا ضروری ہے ۔ مثلاً کنویسنگ اور اقتدار طلبی کے لئے دوڑ دھوپ
کو یکسر ممنوع قرار دیا جائے اور ممبری یا وزارت کے لئے روپیہ
خرچ کرنے یا دھونس دھاندلی سے کام لینے کو جرم ٹھہرایا جائے
محلے والے خود اپنے حلقے سے مخلص ، محنتی اور تجربہ کار افراد کا
انتخاب کریں ۔ اور حکومت ذرائع ابلاغ سے کام لیتے ہوئے ان کا
تعارف کرائے ۔ ممبری کے لئے اشتہار بازی ، جلسہ ، جلوس کو بھی
ممنوع قرار دیا جائے ۔ یہ سب کام غیر جماعتی بنیادوں پر ہونا چاہیئے ۔
جماعت سازی یا گروپ بندی اور دھڑے بندی ، نہ الیکشن سے
قبل اس کی اجازت دی جائے اور نہ الیکشن میں کامیابی کے بعد
مجلس شوریٰ میں اس کا موقع دیا جائے ۔

آخر میں اتنی گزارش ہے کہ کیا وجہ ہے کہ تمام جماعتوں کا
ایک ہی مقصد ہے یعنی اسلامی نظام کا قیام ، اور سب نے الیکشن
ہی کو اس کا ذریعہ قرار دیا ہے ۔

اور موجودہ حکومت نے بھی بحالی جمہوریت کا اعلان
کر دیا ہے ۔ اور اس کا مقصد وحید بھی دین اسلام کا فروغ اور غلبہ
ہے ۔ اور اس کے لئے اس نے کئی اقدامات بھی کئے ہیں ۔ اب کونسی
رکاوٹ ہے کہ سب سیاسی جماعتیں اور موجودہ حکومت کے ذمہ دار
افراد ایک ہی جماعت کی لڑی میں منسلک ہو جائیں اور ایک ہی
امت کا روپ دھار لیں ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرقہ بندی اور سیاسی عصبیت
کی شدت نے ہر ایک کو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے پر مجبور کر دیا
ہے ۔ اتحاد و ادغام تو بڑی بات ہے ۔ اسلام کی خاطر باہمی تعاون و تناصر

کی صورت بھی نظر نہیں آتی۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب کسی مجموعۂ اشیاء پر ایک مرتبہ تفریق کا عمل جاری ہو جائے تو پھر وہ کسی حد پر نہیں رُکتا بلکہ تفریق در تفریق کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی حال اُمتوں اور قوموں کا ہے۔ اگر امت میں ایک مرتبہ تفریق کا عمل شروع ہو جائے تو اسے روکا نہیں جا سکتا۔ آج کل ہمارے ہاں سیاسی پارٹیوں اور "مذہبی" فرقوں کا یہی حال ہے کہ ایک ہی پارٹی کئی کئی متحارب گروہوں اور گروپوں میں بٹ گئی ہے۔ یہ تفریق در تفریق کا عمل صرف سیاسی جماعتوں کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ مذہبی تنظیموں اور جماعتوں کا بھی یہی حال ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے دور میں جب سیاسی انتشار رونما ہوا۔ تو سب سے پہلے خوارج نمودار ہوئے اور پھر دوسری جماعتوں نے سر اٹھایا اس طرح تفریق و انتشار بڑھتا ہی چلا گیا۔ آج کل عالمِ اسلام میں مسلمانوں کا جو حال ہے اس کا نقشہ ذیل کے شعر میں ملاحظہ کیجیے۔

تشعبوا شعبًا فكل مدينة
فيها امير المؤمنين ومنبر

یعنی "لوگ گروہوں میں بٹ گئے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر شہر میں امیر المؤمنین اور منبر جلوہ فرما ہیں۔ پاکستان کا تو یہ حال ہے کہ یہاں اکثر بڑے بڑے شہروں میں متعدد مذہبی امیر المؤمنین اور سیاسی امام المسلمین پائے جاتے ہیں اور ان کی پارٹیاں یا جماعتیں اپنی جگہ مستقل اُمتیں ہیں۔ اسی لئے ایک جماعت کا رکن دوسری پارٹی کا ممبر نہیں بن سکتا۔ اور عام طور پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پارٹی کا انتخابی منشور دیکھو۔ اس کے ارکان یا افراد کے اعمال کو نہ دیکھو۔ ایک مشہور سیاسی پارٹی کے بارے میں کہا گیا تھا کہ اگر اس کی قیادت کی طرف سے کھمبے کو بھی انتخابی ٹکٹ مل جائے تو پھر اس کو ووٹ دینا ملی فریضہ ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جمہوری نظام میں کردار کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ صرف گفتار اور تعداد کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ علامہ اقبال مرحوم نے کہا ہے۔

ع جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

"يد الله على الجماعة" کی تشریح گزشتہ صفحات میں کی جا چکی ہے۔ یہاں ایک اہم حوالہ کا ذکر فائدے سے خالی نہ ہو گا۔

قال الترمذی وتفسير الجماعة عند اهل العلم، هم اهل الفقه والعلم والحديث «

سئل ابن مبارك من الجماعة قال: ما وافق الحق وان كنت وحدك» رواه ابن عساكر في تاريخ دمشق بسند صحيح عنه ۲/۳۲۲/۱۳، ۔ امام ترمذی کا قول ہے کہ اہلِ علم کے نزدیک جماعت سے مراد اصحاب فقہ و حدیث اور علماء دین ہیں۔ عبداللہ بن مبارک سے سوال کیا گیا کہ "جماعة" کون ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا، ابو بکرؓ اور عمرؓ۔ لوگوں نے کہا کہ وہ تو وفات پا چکے ہیں۔ انہوں نے کہا فلاں اور فلاں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا۔ الجماعة وہ ہے جو حق کی موافقت کرے خواہ تُو اکیلا ہی ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ آج کل کی خواہ "مذہبی" امارتیں ہوں یا سیاسی تنظیمیں ان سب کا نتیجہ اُمتِ اسلامیہ میں تفریق در تفریق کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔

ان کے نقصانات اور مفاسد، مصالح اور فوائد سے کہیں زیادہ ہیں۔ اس لئے ایک اسلامی ریاست میں تعلیمی، تصنیفی، تبلیغی اور رفاہی ادارے "تعاونوا على البر والتقوىٰ" اور "بعضهم اولياء بعض" کی بنیاد پر قائم کئے جا سکتے ہیں۔

لیکن تنظیمی ڈھانچے کھڑے کرنے اور ہر ذہین یا متحرک شخصیت کا ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنانے کا شرعًا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ فبشر عبادي الذين يستمعون القول فيتبعون احسنه۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العلمين

قسط ۲ آخری

مولانا گوہر رحمٰن شیخ الحدیث دارالعلوم تفہیم القرآن، مردان

= شیخ عبدالحق کی فارسی عبارت دراصل طحاوی کی [illegible] کا ترجمہ ہے اور مولانا نصیر الدین نے شیخ عبدالحق کی عبارت کا اردو ترجمہ نقل کر دیا ہے اس کا بھی وہی [illegible] ہے جو طحاوی کی عبارت کا ہے کہ قصاص اور وجوب [illegible] میں مرد اور عورت کا فرق نہیں ہے باقی رہا عورت کی دیت کی مقدار کا مسئلہ تو ان تینوں حضرات [illegible] مسئلے کو یہاں پر ذکر کیا ہی نہیں ہے اس بارے میں شیخ [illegible] کا مسلک اس کی عربی شرح مشکوٰۃ میں اس طرح بیان [illegible]

[illegible] ما حیا ثم مات تجیب بکمال دیۃ الکبیر فان کان [illegible] میتۃ من الاطلاق فان کان انثی فخمسون لان نصف دیۃ الرجل (لمعات از شیخ عبدالحق بر حاشیہ ص ۳۰۲ باب الدیات)۔

[illegible] = اگر جنین (بچہ) ماں کے پیٹ سے زندہ گرا [illegible] میں مر گیا تو اس صورت میں پوری دیت واجب ہوگی [illegible] ۱۰۰ اونٹ واجب ہوں گے اور اگر لڑکی تھی تو ۵۰ [illegible] واجب ہوں گے اس لئے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت [illegible] نصف ہے۔

[illegible] قادری صاحب نے فرمایا ہے کہ مشکوٰۃ کا پورا باب الدیات [illegible] ہے اور یہ کہ شیخ عبدالحق کی کتاب معروف عالم ہے ہر [illegible] کھلی آنکھوں سے پڑھ سکتا ہے ہم نے کھلی آنکھوں سے [illegible] بھی اور آپ کے کہنے پر دوبارہ آنکھیں اور زیادہ کھول [illegible] بھی ہے مگر آپ نے مشکوٰۃ ہی کے حاشیے پر درج عبارت کیوں نہ پڑھی؟ آپ کی آنکھوں کو تو زیادہ [illegible] تھا۔

[illegible] = باقی رہا ابو الولید باجی کا حوالہ جس کے بارے [illegible] قادری صاحب کا دعویٰ ہے کہ اس میں امام ابو [illegible] اور امام شافعی سے بھی مرد اور عورت کی دیت کی برابری کا قتل ہوا ہے۔

جناب مجھے افسوس ہے کہ آپ بہت بڑی زیادتی کر رہے ہیں آپ نے المنتقی کے جس صفحے کا حوالہ دیا ہے اسی صفحے اور جلد کے حوالے سے (یعنی جلد ۷ صفحہ ۸۷) ترجمان القرآن کے متن کے شمارے میں پورا عربی متن نقل کر دیا گیا ہے جسے ملک کے ہزاروں قارئین نے پڑھ لیا ہوگا یہ زیادتی خود آپ اپنے ساتھ کر رہے ہیں جب قارئین باجی کی اصل عبارت اور آپ کا دعویٰ پڑھیں گے تو سوچیں گے کہ وہ کیا رائے قائم کریں گے آخر یہ مسئلہ سپریم کورٹ کے شرعی بنچ میں بھی تو کسی وقت پیش ہوگا کیا وہاں یہ مغالطے آپ کو کام دے سکیں گے؟ پوری عبارت دوبارہ غور سے پڑھیں اور تلاش حق کی نیت سے پڑھیں اس پوری عبارت کا تعلق زخموں کی دیت سے ہے قتل نفس کی دیت سے نہیں ہے اور آپ اس کو پیش کر رہے ہیں دیت نفس میں برابری کے ثبوت میں آخر یہ استدلال کی کونسی قسم ہے؟ ابو الولید کا مقصد یہ ہے کہ حضرت علی اور حضرت عمر سے امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے مسلک کے مطابق بھی روایت منقول ہے کہ زخموں کی دیت قلیل کثیر دونوں میں مرد کی دیت سے نصف ہے اور امام مالک کے مسلک کے مطابق بھی ان سے ایک روایت آئی ہے کہ زخموں کی دیت ثلث (⅓) تک تو برابر ہے لیکن اس کے بعد زخموں کی دیت بھی نصف ہے ترجمان القرآن میں ۵ واضح قسم کے قرائن سے ثابت کیا گیا ہے کہ ان کا علی دیۃ الرجل فی القلیل و الکثیر وبہ قال ابو حنیفۃ والشافعی وروی عنہما (ای عن عمر وعلی) حتی قولنا (ای المالکیہ) میں فقط نصف رہ گیا ہے یا کاتب سے یا خود مصنف سے آپ خود ماشاء اللہ عربی جانتے ہیں کیا علی دیۃ الرجل کے معنی (مرد کی دیت برابر) ہو سکتے ہیں؟ کیا لفظ علی کسی حل کے معنوں میں آیا ہے؟ وبہ قال کے معنی تو یہ ہیں کہ یہی ابو حنیفہ اور شافعی کا مسلک ہے پھر کیا ان دونوں آئمہ کا مسلک یہی ہے کہ قتل عورت کی دیت مرد کی دیت کے برابر ہے؟ [illegible] میں حضرت عمر اور حضرت علی سے مروی جو قول نقل ہوا ہے یہی وہی قول ہے جسے بیہقی نے اس طرح نقل کیا ہے "جراحات النساء علی [illegible] من دیۃ الرجل فیما کثر جراح الرجال والنساء سواء الا الثلث۔ (سنن کبریٰ جلد ۸۔ ص ۹۶، ۹۷)

د۔ قادری صاحب کا دعویٰ ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ کے مخطوطے میں حضرت عمر سے عورت اور مرد کی دیت میں برابری بھی ثابت ہے۔

میرے پاس مصنف ابن ابی شیبہ کی مطبوعہ پہلی پانچ جلدیں تو موجود ہیں لیکن باقی جلدوں کا مخطوط موجود نہیں ہے اسلئے اصل عبارت میرے پیش نظر نہیں ہے اور قادری صاحب نے عبارت نقل نہیں کی صرف دعویٰ کیا ہے مجھے یقین ہے کہ حضرت عمر سے قتل نفس کی دیت میں برابری کا کوئی قول مروی نہیں ہے ہاں زخموں کی دیت میں ⅓ تک برابری کی ایک روایت حضرت عمر سے مروی ہے قادری صاحب کو چاہئے کہ اصل عربی عبارت کا پورا متن شائع کرائیں تاکہ پتہ چل سکے کہ بات کیا ہے اور پیش کس طرح کی گئی ہے آخر مصادر و مراجع تک آپ کے علاوہ دوسروں کی بھی رسائی ہو سکتی ہے حقیقت کو محض دعووں سے تو چھپایا نہیں جا سکتا۔

اقوال صحابہ کے ثابت نہ ہونے کا دعویٰ۔

جناب پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ میں وثوق، اعتماد اور ذمہ داری کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ حضرت عمر، حضرت علی وغیرہ کے اقوال عورت کی دیت کے نصف ہونے کے بارے میں ثابت نہیں ہیں۔

تبصرہ و تجزیہ۔

اچھا ہوا کہ قادری صاحب نے یہ بحث چھیڑ دی اس کی وجہ

سے مجتہات کو حدود واضح کرنے کا موقع مل گیا ہے۔

الف = اس بارے میں پہلے تو علم اصول حدیث کا ایک [illegible]

[illegible] متعین کرلینا چاہیے [illegible]

[illegible]

امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام احمد [illegible] ہے کہ [illegible] بشرطیکہ راوی خود ثقہ ہو کیونکہ امام ابو حنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ تابعی اور تبع تابعی کی حدیث مرسل اس کی حدیث متصل سے بھی قوی تر ہوتی ہے اس لئے کہ جب یہ یقین کے ساتھ اپنے شیخ کا نام لئے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابی کا قول نقل کرتا ہے تو اس کو سند کی صحت اور اپنے شیخ کو ثقہ ہونے پر پورا یقین ہوگا۔

امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ حدیث مرسل حجت نہیں ہے مگر کچھ شرائط کے ساتھ امام شافعی بھی اس کو حجت تسلیم کرتے ہیں وہ شرائط یہ ہیں۔

۱۔ مرسل حدیث کی تائید میں کوئی دوسری متصل یا مرسل روایت موجود ہو۔

۲۔ اس کی تائید میں کسی صحابی کا قول یا اکثر اہل علم کا قول موجود ہو۔

۳۔ حدیث مرسل کے راوی کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ وہ مجروح راویوں سے روایت نقل نہیں کرتے تھے بلکہ ثقہ ہی سے روایات نقل کرتے تھے ایسے راوی کی مرسل حدیث بھی حجت ہے۔

اس قاعدے اور بیان مذاہب کے لئے مندرجہ ذیل مصادر کی طرف رجوع کریں۔

؟ الکفایہ از خطیب بغدادی ص ۳۸۴۔ اصول بزدوی ص ۱۷۱۔

الاحکام از آمدی جلد ۲ ص ۱۷۷ تا ۱۸۱ ؟ علوم الحدیث از ابن صلاح ص ۴۹، ۵۰۔

التمہید از ابن عبدالبر جلد ۱ ص ۳۰ طبع لاہور۔

ب = اس قاعدے ہی کی تشریح میں دوسرا قاعدہ ملاحظہ کیجئے۔

جو محدثین حدیث مرسل کو حجت تسلیم نہیں کرتے ان کے نزدیک بھی بعض تابعین کی مرسل روایات صحیح تسلیم کی گئی ہیں اس لئے کہ یہ ثقات ہی سے روایت کرتے تھے۔

ان میں سے سرفہرست امام عامر بن شراحیل شعبی ہیں امام ذہبی لکھتے ہیں کہ امام شعبی کی مرسل احادیث صحیح ہوتی ہیں۔ (تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۷۹) ابن حجر لکھتے ہیں کہ العجلی کے نزدیک شعبی کی مراسیل صحیح ہیں اور ابراہیم نخعی کی مراسیل کے مقابلے میں مجھے زیادہ پسند ہیں۔ (تہذیب التہذیب جلد ۵ ص ۶۷، ۶۸)

دوسرے جلیل القدر تابعی ابراہیم نخعی ہیں جن کے بارے میں ابن عدی نے یحییٰ ابن معین کا قول نقل کیا ہے کہ ان کی مراسیل حجت ہیں اور صحیح ہیں بلکہ محدثین ابراہیم نخعی کی مراسیل کو ان کی مسندات سے زیادہ قوی اور صحیح سمجھتے ہیں اس لئے کہ جب یہ کسی روایت کو متعدد ثقہ راویوں سے سنتے تو ان کے نام نہیں لیتے تھے اور جب ایک ہی راوی سے سنتے تھے تو اس کا

نام لے لیتے تھے مندرجہ ذیل مصادر میں یہ قاعدہ بیان ہوا ہے۔

التمہید از ابن عبدالبر جلد ۱ ص ۳۰ ۳۸

دارقطنی [illegible]

[illegible]

[illegible]

تیسرے سعید بن مسیب ہیں جو صحابی کے بیٹے تھے عشرہ مبشرہ سے ان کی ملاقات ثابت ہے اہل حجاز کے فقیہ اور مفتی تھے اور مدینہ کے مشہور سات مشاہیر فقہاء میں سے تھے یحییٰ بن معین اور دیگر محدثین کہتے ہیں کہ ان کی مراسیل سب سے زیادہ قوی اور صحیح ہوتی تھیں۔ (نصب الرایہ جلد ۲ ص ۳۲۳۔ زاد المعاد از ابن قیم بحث نکاح الحامل جاء لیسیب۔ تدریب الراوی ص ۱۲۳۔)

اسی طرح قاضی شریح کی مرسلات کی صحت کو بھی بطور استدلال تسلیم کیا گیا ہے جن کو حضرت عمر نے قاضی مقرر کیا تھا اور حضرت علی کے زمانے تک کوفہ کے قاضی رہے تھے اسی وجہ سے کہ وہ بڑے تابعین ہیں جن کی مراسیل بالا جماع صحیح اور بمنزلہ متصل تسلیم کی گئی ہیں۔

ج۔ ان دو قواعد کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد اب آیئے حضرت علی اور حضرت عمر کے اقوال کے اسانید کی طرف

۱۔ "امام محمد امام ابو حنیفہ سے وہ حماد سے وہ ابراہیم نخعی سے اور وہ حضرت علی سے نقل کرتے ہیں کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے قتل میں بھی اور زخموں میں بھی"

۲۔ امام محمد، محمد بن ابان بن صالح قرشی سے وہ حماد سے وہ ابراہیم نخعی سے اور وہ حضرت عمر اور حضرت علی دونوں سے نقل کرتے ہیں کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف ہے قتل اور زخموں دونوں میں۔ عمر اور علی دونوں سے مروی اس روایت کے خلاف دوسری روایت پر عمل نہیں کرنا چاہیے۔" (کتاب الحجہ از امام محمد حنفی ۱۸۹ھ جلد ۴ ص ۲۷۷ تا ۲۸۴ طبع لاہور)

یہ اسی کتاب کا حوالہ ہے جس کے مطالعے کا مشورہ قادری صاحب نے دیا ہے کہ اس کے حاشیے کو بھی دیکھ لیا جائے۔ حاشیے میں زخموں کی دیت ثلث تک برابر ہونے پر دلالت کرنے والی روایات کو ضعیف قرار دیا ہے اور مطلق دیت کے نصف ہونے کو ثابت کیا ہے لیکن درج بالا حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ حدیث امام ابو حنیفہ کی جامع المسانید جلد ۲ ص ۱۸۰ اور امام محمد کی کتاب الآثار میں بھی موجود ہے۔ اب بتائیے کہ اس کا کون سا راوی ضعیف اور کمزور ہے اور ابراہیم نخعی کی مراسیل تو بالا جماع صحیح بلکہ اس کی مسندات سے بھی زیادہ قوی ہوتی ہیں۔ باقی تابعین کی روایت سے حضرت عمر اور حضرت علی اور دوسرے اصحاب کے اقوال کا تفصیلی ذکر مع حوالہ جات ترجمان القرآن شمارہ جون میں موجود ہے۔

۳۔ امام بیہقی نے اپنے سند کے ساتھ امام شعبی سے نقل کیا ہے کہ حضرت علی فرمایا کرتے تھے "عورتوں کے زخموں کی دیت بھی مرد کے زخموں کی دیت سے نصف ہے، قلیل و کثیر دونوں میں"۔ بیہقی نے اس کی سند پر کوئی جرح

نہیں کی اور اس کے بعد ابراہیم نخعی سے حضرت علی اور حضرت عمر کا بھی قول اسی سند کے ساتھ نقل کیا ہے جو امام محمد کی کتاب الحجۃ میں نقل ہوا ہے۔ ساتھ ہی فرمایا ہے کہ ابراہیم کی سند کو [illegible] شعبی کی روایت کو اس سے تائید [illegible]

[illegible]

اس کے متعلق کہا ہے کہ بیہقی کے نزدیک شعبی کی حدیث منقطع نہیں ہے۔

واضح رہے کہ امام شعبی علامۃ التابعین الحافظ الامام کے القاب سے یاد کیے جاتے تھے۔ ذہبی نے لکھا ہے کہ یہ حضرت عمر کی خلافت کے وسط میں پیدا ہوئے تھے۔ (تذکرہ جلد ۱ ص ۷۹)

بعض کے نزدیک یہ ۱۷ھ اور بعض کے نزدیک ۲۱ھ میں

پیدا ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی ملاقات پانچ سو صحابہ سے ہوئی تھی (بعض کے نزدیک ۱۵۰ صحابہ سے ملاقات تھی) ان کی تاریخ وفات میں ۴ اقوال نقل ہوئے ہیں ۱۰۳، ۱۰۵ھ، ۱۰۶ھ، ۱۰۷ھ (مقدمہ تحفۃ الاحوذی جلد ۱ ص ۵۴ تا ۵۵ بحوالہ ابن خلکان)

حضرت عمر سے تو اس کی روایت مرسل ہے لیکن حضرت علی سے اس کی روایت بعض محدثین کے نزدیک ثابت ہے صحیح بخاری کتاب الحدود باب رجم المحصن میں شعبی روایت حدثنا عن علی کے الفاظ کے ساتھ آئی ہے اور حدثنا کا لفظ براہ راست روایت کے لئے استعمال ہوتا ہے نیز امام بخاری اپنی جامع صحیح میں مرسل اور منقطع روایات لاتے نہیں ہیں۔ ان دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ شعبی کی ملاقات اور روایت حضرت علی سے ثابت ہے۔ بعض کے نزدیک رجم کی حدیث انہوں نے حضرت علی سے سنی جو بخاری میں آئی ہے لیکن دوسری کوئی حدیث براہ راست حضرت علی سے انہوں نے نہیں سنی۔ بہر حال اگر یہ روایت ہو تو پھر بھی کوئی اثر نہیں پڑتا اس لئے کہ شعبی کے مراسیل بالا جماع صحیح اور مسندات کی ہم پایہ ہوتی ہیں۔

اجماع کے ثابت نہ ہونے کا دعویٰ

جناب قادری صاحب کا دعویٰ ہے کہ یہ مسئلہ شروع سے مختلف فیہ رہا ہے اور اجماع ہونے کے بیانات حضرات شدت کے مشہور ہیں اس کے بعد کچھ اقوال نقل کئے ہیں۔

تبصرہ تجزیہ

آپ نے جو اقوال نقل کئے ہیں اور اس کے علاوہ اور بھی تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ یہ سارے اقوال زخموں کی دیت سے متعلق ہیں جو زیر بحث مسئلہ نہیں ہے۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے اب دوبارہ عرض کر رہا ہوں کہ صرف قتل نفس کی دیت کے برابر ہونے کا کوئی ایک قول صحابی، تابعی یا تبع تابعی کا نقل کیجئے سامنے لایئے، پوشیدہ نہ رکھئے۔ بصورت دیگر آپ کے اس دعوے کی آخر کیا حیثیت رہ گئی کہ یہ مسئلہ شروع ہی سے مختلف فیہ رہا ہے۔ ابن علیہ اور اصم کا تذکرہ تو آگے آرہا ہے ان کے علاوہ کسی فقیہ کا قول پیش کیجئے جس نے قتل نفس کی دیت کے برابری کا قول دیا ہو۔

باقی رہی جنایات کی بات تو کیا امام شافعی، ابن جریر طبری، شمس الائمہ سرخسی، محی السنۃ، ابن عبدالبر، ابن جوزی، کاشانی، ابن قدامہ حنبلی، امام قرطبی، ابن رشد مالکی، قاضی شوکانی اور دیگر ممتاز اور مشہور و معروف فقہاء و محدثین کا حوالہ اجماع جنایات کا منکر تھا؟ کیا یہ سب بزرگ جناتی فیصلے کیا کرتے تھے؟ ہم نے اپنی طرف سے تو اجماع کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ یہ دعویٰ نسلاً بعد نسل چلا آرہا ہے۔ ہم نے تو صرف کتابوں کا حوالہ دے دیا ہے۔ ہم تو کسی ایک امام اور فقیہ کی رائے کے مقابلے میں بھی اپنی رائے پیش کرنے سے ڈرتے ہیں کیونکہ ہم کو اپنا مبلغ علم معلوم ہے۔

قادری صاحب علم و اجتہاد کے اس منصب پر نہ جانے کیسے فائز ہوئے کہ ائمہ اربعہ، اہل ظاہر اور اہل تشیع کے متفقہ قول کو جناتی کہہ کر بے دریغ رد کر رہے ہیں۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ اجماع سکوتی ہے جو بعض ائمہ کے نزدیک حجت نہیں ہے۔ میں گزارش کروں گا کہ اسلاف سکوتی نہیں بلکہ اجماع بہ عمل تعامل امت و سنت خلفاء راشدین ہے۔ آخر جب حضرت عمر اور حضرت علی نے عورت کی دیت کے نصف ہونے کا فیصلہ کیا اور یہ خلافت راشدہ کا قانون بنا تو خلافت راشدہ کے اختتام ۴۰ھ تک کسی صحابی نے اس پر تنقید کیوں نہ کی اور اختلاف کیوں نہ کیا؟ ۴۰ھ کے بعد بھی قرن ثانی (تابعین) اور قرن ثالث (تبع تابعین) میں کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ اس کے بعد آنے والے محدثین اور فقہاء میں سے بھی کسی نے مخالف رائے کا اظہار نہیں کیا (قتل خطا کی دیت کے مسئلے میں) ابن علیہ اور اصم کے علاوہ ہم کو کوئی قول فاروقی اور مرتضوی فیصلے کے خلاف معلوم نہیں ہے۔ اختلاف آراء جو بھی ہے زخموں کی دیت میں ہے۔ آخر یہ اجماع اور تعامل نہیں ہے تو کیا ہے؟ اجماع کے بارے میں مزید معلومات کے لئے ترجمان القرآن ستمبر کے شمارے کا مطالعہ کیجئے۔

قادری صاحب نے امام رازی اور ابن قدامہ کے حوالے سے ابن علیہ اور ابوبکر الاصم کا مسلک نقل کیا ہے کہ یہ دونوں دیت میں مساوات کے قائل تھے لیکن رازی نے اس قول کو فقہاء کے فیصلے کے مقابلے میں نقل کر کے صرف واللہ اعلم کہا ہے اس کی تائید نہیں کی اور ابن قدامہ نے اس قول کو شاذ اور مخالف اجماع کہہ کر رد کر دیا ہے۔ (تفسیر کبیر جلد ۱۰ ص ۲۳۳۔ المغنی جلد ۸ ص ۳۰۲)

پہلے تو مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ عمرو بن حزم کے خط میں عورت کی دیت کے نصف ہونے کے اضافے کو ابن قدامہ نے نقل کیا ہے اور آپ اسے نہیں مانتے اس لیے کہ کتب احادیث میں یہ اضافہ موجود نہیں ہے تو کیا ابن علیہ اور اصم کا یہ قول کسی کتاب میں سند صحیح کے ساتھ نقل ہوا ہے اسے بھی تو ابن قدامہ نے نقل کیا ہے اور دوسری کتابوں میں بھی بغیر سند کے نقل ہوا ہے آخر اس قول کا استناد و وزن کیا ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ ابوبکر الاصم کے بارے میں لسان المیزان کے حوالے سے ترجمان القرآن کے جون اور جولائی کے شماروں میں ثابت کیا گیا ہے کہ یہ معتزلی تھے جن کی رائے اہل سنت کے اجماع کے خلاف قابل قبول نہیں ہے۔ آپ ان کا مرتبہ بڑھانے کے لئے کہتے ہیں کہ مبسوط میں ان کا نام آتا ہے لیکن اس شہ کا دلیل کی روشنی میں یہ بھی تو غور کیجئے کہ نام اور حوالہ تو ہماری کتابوں (بلکہ امہات الکتب) میں معتزلہ کا بھی آتا ہے بلکہ غیر مسلموں کا بھی۔ فی نفسہ بات اگر صحیح ہو تو اس کی تائید بھی کی جا سکتی ہے لیکن آپ یہ ثابت کریں کہ مبسوط یا اہل سنت کی کسی دوسری کتاب میں اصم کے اس قول کی تائید بھی کی گئی ہے۔ طحاوی، باجی اور شیخ عبدالحق کے حوالوں کی حقیقت تو ہم بیان کر چکے ہیں۔

باقی رہا ابن علیہ تو پہلے یہ ثابت کریں کہ اس سے مراد اسماعیل بن علیہ ہے جو محدثین میں سے تھے اور امام شافعی، امام احمد وغیرہ ائمہ کے استاد تھے۔ اگر اس سے امام شافعی کے استاد مراد ہیں تو کتاب الام میں امام شافعی نے یہ کس طرح لکھ دیا کہ قدیم اور جدید علماء میں سے مجھے ایک عالم بھی معلوم نہیں ہے جو مرد اور عورت کی دیت کی برابری کا قائل ہو۔ (کتاب الام طبع بیروت ۱۳۹۳ھ جلد ۶۔ ص ۱۰۶)

اگر واقعی امام شافعی کے استاد کی رائے مساوات تھی تو یہ اسے نقل کر کے تردید کرتے یا تائید کرتے۔ ادب سے گزارش ہے کہ ابن علیہ کے نام سے زیادہ مشہور اسماعیل کے بیٹے ابراہیم تھے اور بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دیت کی برابری کا قائل ابراہیم بن علیہ ہو گا۔ یہ ابراہیم کون تھا؟ لسان المیزان کے حوالے سے ترجمان القرآن میں ثابت کیا گیا ہے کہ یہ بد عقیدہ اور گمراہ کن شخص تھا۔ اس پر مزید خطیب بغدادی کا حوالہ پیش خدمت ہے۔

"ابراہیم بن اسماعیل ابن ابراہیم بن مقسم ابو اسحاق البصری الاسدی (متوفی ۲۱۸ھ) یہ ابن علیہ کے نام سے مشہور تھا۔ متکلمین میں سے تھا اور خلق قرآن کا قائل تھا۔ امام شافعی کا اس کے ساتھ بغداد میں مناظرے اور مباحثے ہوتے رہتے تھے۔ یہ خبر واحد کو دلیل نہیں سمجھتا تھا۔ یہ ابوبکر الاصم کے ساتھیوں میں سے تھا۔ امام شافعی اور امام احمد نے اس کو ضال اور مضل کہا ہے یعنی گمراہ اور گمراہ کن شخص۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے راستے میں اس سے پوچھا کہ مجھے تو [illegible] میں تضادات نظر آتے ہیں۔ اس پر اس نے کہا کہ قرآن میں اور بھی بہت سے تضادات موجود ہیں۔" (نعوذ باللہ) (تاریخ بغداد از خطیب بغدادی جلد ۶ ص ۲۰ تا ۲۳ نمبر ۳۰۵۳)

اس مستند حوالے سے ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ ابراہیم بن علیہ ابوبکر الاصم کا غلام اور مصاحب تھا اور یہ دونوں استاد شاگرد معتزلی اور گمراہ کن تھے اور واضح قسم کے قرینے سے ثابت کر دیا ہے کہ اس جگہ ابن علیہ سے مراد ابراہیم کے والد اسماعیل بن علیہ نہیں۔ جب تک آپ تصریح یا واضح اور کھلے قرائن سے یہ ثابت نہ کریں کہ یہاں اسماعیل بن علیہ ہی مراد ہے اس وقت تک آپ کو اس کا حوالہ دینے کا اخلاقی حق حاصل نہیں ہے۔ لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ دونوں حضرات صحیح عقیدہ اور فاضل افراد تھے پھر بھی اجماع صحابہ اور سنت خلفاء راشدین کے خلاف ان کی بات کو قانونی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ خطیب بغدادی نے اسماعیل بن علیہ کا تعارف بھی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس کی تعریف میں اقوال نقل کئے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ اگرچہ یہ بھی ابن علیہ کہلاتا تھا مگر وہ اس نام کو پسند نہیں کرتا تھا اور لوگوں کو کہتا تھا کہ مجھے اس نام سے نہ پکارا کرو (علیہ اس کی والدہ کا نام تھا) خلق قرآن کے قول کی نسبت اس کی جانب بھی کی گئی ہے لیکن یہ الزام ہے اور غلط فہمی ہے۔ (شاید اس غلط فہمی کا سبب ابراہیم بن علیہ سے کنیت کی مشابہت ہو) تاریخ بغداد جلد ۶ ص ۲۲۹ تا ۲۴۰۔ نمبر ۳۲۷۷)

قادری صاحب فرماتے ہیں کہ آج کے دور میں بہت سے گھرانوں کے اخراجات کی کفالت کا انحصار عورت پر بھی ہو گیا ہے اور عورت کے مرنے سے مرد کے برابر اور کبھی مرد سے بھی زیادہ نقصان ہو سکتا ہے۔

تبصرہ

آپ کو معلوم ہو گا کہ قانون اکثریت اور معاشرے کے عمومی حالات کو ملحوظ رکھ کر بنایا جاتا ہے اور ایسی صورتیں شاذ و نادر ہی ہو سکتی ہیں کہ گھرانے کی کفالت کا انحصار عورت پر ہو۔ ایسی صورت میں تغلیظ دیت کے اصول پر نصف دیت کے علاوہ جرمانہ بطور تعزیر وصول کر کے مقتولہ کے وارثوں کو دیا جا سکتا ہے لیکن قانون وہی ہو گا جو سنت رسول، سنت خلفاء راشدین اور تعامل و اجماع سے ثابت ہے۔ استثنائی صورتوں کے لیے وقتی حل نکالا جا سکتا ہے، لیکن قانون شرعی کو شاذ و نادر صورتوں کی وجہ سے بدلا نہیں جا سکتا۔

شدت و عصبیت کی شکایت

قادری صاحب فرماتے ہیں کہ ہمارے علماء نے اس مسئلے میں شدت و عصبیت کی روش اختیار کر لی ہے، حالانکہ اختلاف رائے رحمت ہے اور مجتہدین شدت سے کام نہیں لیتے تھے۔

تبصرہ

اختلافی مسائل میں کسی ایک رائے کو ترجیح دی جا سکتی ہے اور ایسے مسائل میں اختلاف رائے یقیناً رحمت ہے، بشرطیکہ دلائل پر مبنی ہو، خود غرضی پر مبنی نہ ہو۔ اور فروعی و اختلافی مسائل کو عصبیت اور شدت کا ذریعہ بنانا یقیناً مذموم ہے لیکن یہ مسئلہ تو اجماعی ہے اختلافی نہیں ہے۔ پھر باوجود اجماعی ہونے کے ہم نے تشدد اور تعصب سے کام نہیں لیا بلکہ دلائل سے بات کی ہے اور کرتے رہیں گے۔

استحسان و استصلاح پر عمل کرنے کی دعوت

پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ دفع شر، ضرورت اور مصلحت کے لئے استحساناً اور استصلاحاً قیاس سے ہٹ کر یا شاذ قول پر بھی فیصلہ ہو سکتا ہے اور اس کی مثالیں موجود ہیں۔

تبصرہ

بجا فرمایا آپ نے لیکن استحسان اور مصالح مرسلہ پر قیاس کے خلاف عمل کیا جا سکتا ہے نصوص اور اجماع کے خلاف مصالح مرسلہ اور استحسان پر عمل کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔ اس کی کوئی مثال ہی ملتی ہے۔ شریعت کا یہ قانون ہماری

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

طاہرہ شاکر
(قسط ۲ آخری)

اسلام اور بنیادی ضروریات کی فراہمی

خلفائے راشدین کا احساس ذمہ داری

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔

"خلافتِ راشدہ کا پورا دور اس قسم کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلفائے راشدین اپنی ذمے داری کے بارے میں کس قدر متفکر رہتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس فکر نے صرف دو سال کے قلیل عرصے میں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا"[۶]

حضرت عمرؓ کو اپنی اس ذمے داری کا اس قدر احساس تھا کہ آپ نے فرمایا:۔

لومات جمل ضیاعا علیٰ شط الفرات لخشیت ان یسئلنی اللہ عنہ[۷]

"اگر ساحل فرات پر کوئی اونٹ بے سہارا مر جاتے تو مجھے ڈر ہے کہ مجھ سے اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ جواب طلب کرے گا۔"

ایک موقع پر عام خطبے میں اپنی ذمے داریاں گنتے ہوئے آپ نے ارشاد فرمایا:۔

ایھا الناس ان اللہ قد کلفنی ان اصرف عنہ الدعاء[۸]

"گویا اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ ذمے داری عائد کی ہے کہ میں اس کے حضور کی جانے والی دعاؤں کو روکوں"۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک اور موقع پر فرمایا۔

ومن اراد ان یسأل عن المال فلیاتنی فان اللہ جعلنی خازنا وقاسما[۹]

"اور جو مال مانگنا چاہے وہ میرے پاس آئے کیونکہ اللہ نے مجھے (اپنے مال کا) خزانچی اور تقسیم کنندہ بنا دیا ہے"۔

ابن جوزی لکھتے ہیں:۔ "اپنی اس ذمے داری کے احساس کو عملی جامہ پہنانے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اہتمام کا کیا حال تھا، اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸ھ کے مشہور قحط میں عام مسلمانوں کی فکر نے ان کی صحت کو بری طرح متاثر کر دیا تھا۔ اور آپ کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا۔ یہ قحط جس کو عام الرمادہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس قدر شدید تھا کہ نو ماہ تک پورے حجاز میں فقر و فاقہ کا دور دورہ رہا۔ اس زمانے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غذائی اجناس کی عام تقسیم اور سرکاری طور پر ہزاروں افراد کے لئے کھانا پکوا کر دونوں وقت کھلانے کا انتظام کیا۔ قحط کی فکر نے آپ کا یہ حال کر دیا تھا کہ قحط کے بعد صحابہ کرام کہا کرتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ عام الرمادہ کا قحط دور نہ کر دیتا تو ہمیں اندیشہ تھا کہ عمر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے اس مسئلے کی فکر کرتے ہوئے مر جاتے"[۱۰]

---

[۶] مولانا شبلی نعمانی، الفاروق (لاہور ۱۹۶۰ء) ص ۱۱۵
[۷] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ (بیروت، ۱۹۶۰ء) ج ۳، ص ۳۰۵
[۸] ابو محمد عزالدین عبدالعزیز بن السلام، قواعد الاحکام فی مصالح الانام (مصر ۱۹۳۴ء) ج ۱، ص ۱۴۸۔
[۹] بلاذری، فتوح البلدان (قاہرہ ۱۹۳۲ء) ص ۴۴۲
[۱۰] ابن جوزی، سیرت عمر بن الخطاب (مصر ۱۹۲۴ء) ص ۱۰۱

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:۔

"حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے اپنے دور میں اپنی ذمے داریوں کو پوری طرح نبھایا۔ یہ اسی ذمے داری کا عملی مظاہرہ تھا کہ حضرت عثمانؓ ایک قحط کے موقعے پر غلّہ سے لدے ہوئے سینکڑوں اونٹ بازار میں منہ مانگے داموں فروخت کرنے کی بجائے مستحقین پر خیرات کر دیتے ہیں، اور یہ اسی ذمے داری کا تقاضا تھا کہ حضرت علیؓ خود متواتر بھوکے رہ کر اپنے حصے کا کھانا بھی دوسروں کو کھلا کر خوشی محسوس کرتے ہیں اور اپنے اللہ کا شکر بجا لاتے ہیں"[۱۱]

خلافت راشدہ کے بعد بھی اسلامی تاریخ میں اس قسم کی مثالوں کی کمی نہیں۔ خلفائے بنو امیہ نے عطایا کا ایک مستقل محکمہ صرف اس مقصد کے لئے قائم کیا ہوا تھا۔ خلفائے بنو عباس نے نہ صرف اس کو قائم رکھا بلکہ مزید منظم کیا۔ حضرت امیر معاویہؓ نے لوگوں کی حاجتیں پوری کرنے کے لئے خاص طور پر ایک آدمی مقرر فرمایا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے واضح طور پر یہ اعلان کیا تھا۔

"وما احد منکم تبلغنی حاجتہ الا حرصت ان اسد من حاجتہ ما قدرت علیہ"[۱۲]

تم میں سے جس کسی کی ضرورت کا مجھے علم ہوگا اس کی ضرورت پوری کرنے کی میں حتی الامکان پوری کوشش کروں گا۔

الغرض جہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اس باب میں بڑے واضح ہیں کہ بنیادی ضروریات کی فراہمی اسلامی ریاست کی اہم ترین ذمے داری ہے وہاں اسلامی تاریخ کے ہر دور میں اس پر عمل کی نظیریں اس بات پر شاہد ہیں کہ اسلامی ریاست کے منصب صدارت پر فائز ہونے والے ہر فرد نے اس ذمے داری کو احسن طریقے سے نبھانے کی پوری کوشش کی ہے

اسلام بنیادی ضروریات کی فراہمی سودے بازی کی بنیاد پر نہیں کرتا

"اسلام میں عدل اجتماعی" کے مصنف لکھتے ہیں۔ "افراد معاشرہ کو بنیادی ضروریات کی فراہمی اسلامی ریاست اپنا فرض سمجھ کر کرتی ہے اس کے عوض وہ افراد سے کسی خدمت یا کسی معاوضے کی طالب نہیں ہوتی اس کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا کہ اس طرح افراد معاشرہ اپنے پاؤں پر آپ کھڑے ہونے کے قابل ہو سکیں گے اور زندگی کی جد وجہد میں بھرپور حصہ لے سکیں گے اسلام بنیادی ضروریات کی فراہمی سودے بازی کی بنیادوں پر نہیں کرتا اس سلسلے میں اسلام اور سوشلزم کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے سوشلزم بنیادی ضروریات فراہم کرتا ہے مگر افراد کی صلاحیت کار کی قیمت کے طور پر۔ ان کو روٹی کپڑا اور مکان مہیا کرتا ہے۔ مگر جانوروں کی طرح سے ان سے دن رات کام لے کر۔ اس کے بعد بھی ان کو طرح طرح کی پابندیوں میں جکڑ کر ان کی آزادی ضمیر کو نفع کے طور پر وصول کرتا ہے۔ اس کے بالمقابل اسلام افراد معاشرہ کو بنیادی ضروریات ان کا انسانی حق سمجھ کر فراہم کرتا ہے۔ اور ان کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے صلاحیت کار کو جہاں چاہیں استعمال کریں اور پوری آزادی کے ساتھ زندگی کی دوڑ میں حصہ لیں"[۱۳]

چند دیگر اہم ضروریات اور اسلامی ریاست کی ذمے داری

اب تک ہم ان ضروریات کو زیر بحث لائے ہیں جن پر انسانی زندگی کی بقاء کا انحصار ہے اور جن کو اسلام کے علاوہ دوسرے نظام ہائے معاشرہ نے بھی انسانی بنیادی ضروریات میں شمار کرتے ہوئے ریاست کو کسی نہ کسی شکل میں ان کی فراہمی کا ذمے دار

---

[۱۱] مولانا امین احسن اصلاحی اسلامی ریاست (لاہور، ۱۹۷۷ء) ص ۱۳۲

[۱۲] ابو محمد عبداللہ بن عبدالحکم، سیرت عمر بن عبدالعزیز (مصر ۱۳۴۶ھ) ص ۱۴۱

[۱۳] سید قطب شہید، مترجمہ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، اسلام میں عدل اجتماعی (لاہور ۱۹۷۷ء) ص ۱۰۴

ٹھہرایا ہے۔ اب ہم چند ایسی ضروریات کا ذکر کرتے ہیں جو بنیادی ضروریات میں تو دخل نہیں مگر اجتماع کو خلل سے بچانے اور اسے صحیح خطوط پر استوار رکھنے کے لئے ان کا اہتمام بھی انتہائی ضروری ہے۔ اسی بنا پر اسلام نے ان کی فراہمی کو بھی مخصوص حالات میں اسلامی ریاست کی ذمے داریوں میں شمار کیا ہے۔

عام تعلیم

اس قسم کی ضروریات میں ایک اہم ضرورت عام تعلیم کی ہے۔ متعدد احادیث و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام عام تعلیم کے اہتمام کو بھی اسلامی ریاست کی ذمے داری سمجھتے تھے۔ بدر کے موقعے پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعدد قیدیوں کا یہ فدیہ مقرر کیا تھا کہ ان میں سے ہر ایک قیدی مدینے کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے۔

طبقات ابن سعد میں ہے۔

عن الوضین بن عطاء قال ثلاثة كانوا بالمدينة يعلمون الصبيان وكان عمر بن الخطاب يرزق كل واحد منهم خمسة عشر درهما كل شهر [۱۴]

"وضین بن عطا سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ مدینہ میں تین آدمی تھے جو بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ اور عمر بن الخطاب ان میں سے ہر ایک کو پندرہ درہم ماہانہ دیا کرتے تھے۔"

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے بھی دیہات کے مسلمانوں کو تعلیم دینے کے لئے معلّم مقرر کئے ہوئے تھے۔ اور ایسے لوگ جو حصولِ تعلیم کی مشغولیت کی بنا پر اپنی روزی کمانے سے قاصر تھے؛ ان کے وظائف بھی مقرر کئے تھے [۱۵]

غرض ان تمام احادیث و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام عام تعلیم کے اہتمام کو بھی اسلامی ریاست کی اہم ترین ذمے داریوں میں شمار کرتا ہے۔

متوفیٰ کے قرض کی ادائیگی

بنیادی ضروریات کے علاوہ دیگر ایسی ضروریات جن کے اہتمام میں اسلام کو بنیادی حیثیت حاصل ہے ان میں ایک ضرورت کسی شخص کے وفات پا جانے کے بعد اس کے چھوڑے ہوئے قرض کی ادائیگی بھی ہے۔ فتوحات کے بعد جب بیت المال میں کافی مال آنے لگا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

أَنَا أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ فَمَنْ تُوُفِّيَ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ فَعَلَيَّ قَضَاؤُهُ [۱۶]

"مجھ سے مسلمانوں کو اپنی جانوں سے بھی زیادہ لگاؤ ہے۔ پس جو مقروض وفات پا جائے اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمے ہوگی"

اس حدیث مبارکہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر اسلامی ریاست کے خزانے میں دوسری ضروریات کی تکمیل کے بعد گنجائش ہو تو اس کے ذمے ان مرنے والوں کے قرض کی ادائیگی بھی ہے جنہوں نے اتنا ترکہ نہ چھوڑا ہو جو ادائے قرض کے لئے کافی ہو۔

متوفیٰ کی بے سہارا اولاد کی کفالت

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرض کے علاوہ متوفیٰ کی دوسری ذمے داریوں مثلاً بے سہارا اولاد کی کفالت کے سلسلے میں بھی اسی قسم کا اعلان فرمایا:۔

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم مَنْ تَرَكَ مَالًا فَلِأَهْلِهِ وَمَنْ تَرَكَ ضَيَاعًا فَإِلَيَّ [۱۷]

---

[۱۴] ابن سعد الطبقات الکبریٰ (بیروت، ۱۹۶۰ء) ج ۳، ص ۲۲۲

[۱۵] قاضی ابو یوسف، کتاب الخراج (قاہرہ، ۱۳۴۶ھ)، ص ۱۹

[۱۶] امام ابو عبید القاسم - کتاب الاموال (قاہرہ، ۱۳۵۳ھ) ج ۱، ص ۲۲۰

[۱۷] ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی - ابواب الفرائض، باب ما جاء من ترك مالا فلورثته۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مال چھوڑے تو وہ مال اس کے وارثوں کے لئے ہے اور کسی کو بے سہارا چھوڑے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔"

اسلامی ریاست کی حیثیت ایک سرپرست کی ہے

شریعت نے دراصل اسلامی ریاست کو اپنے تمام شہریوں کا سرپرست قرار دیا ہے اور سرپرستی کا اولین تقاضا ہے کہ وہ ان ضروریات کی تکمیل کا اہتمام کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مَوْلٰى مَنْ لَا مَوْلٰى لَهٗ [18]

"جس کا سرپرست کوئی نہ ہو اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسول ہے۔"

ایک اور موقعے پر فرمایا۔ اَلسُّلْطَانُ وَلِيُّ مَنْ لَا وَلِيَّ لَهٗ [19] "جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کی سرپرست حکومت ہے۔"

الغرض اسلامی ریاست میں جو شخص بھی ضرورت مند یا مصیبت میں مبتلا ہوگا اس کو اللہ اور اس کا رسول سہارا دیں گے اور یہاں رسول کے الفاظ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ حیثیت مراد ہے جو اسلامی ریاست کے سربراہ کے طور پر حاصل تھی۔ آج سرمایہ داری نظام کے نتیجے میں ضروریات کی فراہمی ہمارے لئے ایک اہم مسئلہ ہے۔ یہ بات چیلنج کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس کا صحیح اور مناسب ترین حل صرف اور صرف اسلام ہے۔ (بشکریہ "المعارف" لاہور)

---

[18] ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی، ابواب الفرائض، باب ماجاء فی میراث الخال

[19] ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی، ابواب النکاح، باب ماجاء لا نکاح الا بولی۔

بقیہ ــــ ادار یہ

پاکستان کے اصل پاسبان ہیں۔

یہاں ہر قسم کے جلوس بدامنی ہی کے مسائل پیدا کرنے کا ذریعہ رہے ہیں اور حکومت کسی ایک جلوس کی بھی نشاندہی نہیں کر سکتی جس میں اسے پولیس اور قانون نافذ کرنے والے ادارے متعین نہ کرنے پڑے ہوں۔

ہماری حکومت جو ملک میں اتحاد و یگانگت کے وعظ کہتی ہے اور اصحاب اقتدار کی زبان سے بین المسالک رواداری کی تلقین کی جاتی ہے وہ بلاشبہ قابل قدر اور مستحسن ہے مگر اس کے ساتھ مختلف مکاتب فکر کے ٹکراؤ کو روکنے کا طریقہ بھی اختیار کرنا چاہئے۔ یعنی ان کو اپنے اپنے حلقوں اور مسجدوں میں مجالس و مواعظ کہنے پر مجبور کرنا چاہئے اور سڑکوں پر مذہبی عقائد کی تشہیر کے جلوسوں پر یک قلم پابندی لگا دینی چاہئے۔ اور یہ یقین رکھنا چاہئے کہ اس اقدام سے نہ شریعت کی خلاف ورزی ہوگی اور نہ کسی مکتبۂ فکر کے عقائد [illegible]

تبصرہ کتب

علیم ناصری

اربعین نبویؐ

ترتیب و تشریح :- پروفیسر عبداللہ شاہین
ضخامت :- چھوٹا سائز ۳۲ صفحات - قیمت درج نہیں
ناشر :- مدینۃ العلم اکیڈمی، حافظ آباد (جلالپور روڈ) ضلع گوجرانوالہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق کہ "جس نے میری امت کے لئے امورِ دین سے متعلق چالیس حدیثیں یاد کرلیں اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن زمرۂ علماء میں اٹھائے گا اور میں اس شخص کی شفاعت کروں گا۔ اور گواہی دوں گا۔ (بیہقی)"۔ بیشتر اہلِ علم نے اپنے اپنے طور پر چالیس چالیس احادیث کے مجموعے شائع کئے ہیں جو امتِ مسلمہ میں وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ چالیس احادیث کا انتخاب ہر مرتب کے اپنے علم و عرفان کے مطابق ہوتا ہے جس میں کوئی ایک مخصوص یا مختلف افادی پہلو ہوتے ہیں جو ہماری روزمرہ زندگی میں پاکیزگیٔ اخلاق، زہد و ورع اور عبادات اور دعاؤں سے مزین ہوتے ہیں۔

پروفیسر عبداللہ شاہین ایک صاحب ذوق اور بلند اخلاق علمی شخصیت ہیں، جنہوں نے "اربعین نبویؐ" مرتب کرکے اپنی نیکیوں میں اضافہ کیا ہے۔ اور اپنے لئے تبلیغ دین کا راستہ متعین کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

تزئینِ ایمان دربیان ختم شریف کی داستان (سلسلہ ۱)

مؤلف :- رانا محمد اکبر ۔ ضخامت - چھوٹا سائز ۴۸ صفحات قیمت ۴ روپے
ناشر :- اکبر پبلیکیشنز ۱۰/۳۱ - اُردو بازار - لاہور

رانا محمد اکبر پیشے کے اعتبار سے ایک خوش نویس ہیں مگر دینی تبلیغ و اشاعت کا جذبہ وافر رکھتے ہیں۔ اپنے کام کے دوران بھی اپنے ہم جلیسوں اور آنے جانے والے حضرات سے کسی نہ کسی دینی مسئلے پر محوِ گفتگو پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے زبانی تبلیغ کے ساتھ اب چھوٹے چھوٹے دینی رسائل شائع کرنے شروع کئے ہیں۔ اور مختلف موضوعات پر اب تک بہت سے کتابچے مرتب کرکے شائع کرچکے ہیں۔ زیرِ نظر کتابچہ "ختم شریف کی داستان" ان کے بنیادی موضوع "تزئینِ ایمان" کا سلسلہ ۱ ہے جس میں مروجہ "ختم" اور "ایصالِ ثواب" کی شرعی حیثیت پر بحث کی گئی ہے۔ مؤلف نے قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ سے آج کل کی رائج شدہ اس بدعت پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اور اس رسم کو خلافِ شریعت ثابت کیا ہے۔ ختم کا سلسلہ یہاں اس قدر زور پکڑ گیا ہے کہ اب یہ ختم ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ اس لئے کہ ختم اللہ علیٰ قلوبھم ...... آلآیۃ کے مصداق

(باقی صـ ۲۳ پر)

بقیہ: عورت کی دیت کا مسئلہ

مصلحت ہی کے لئے ترتیب ہے۔

بین الاقوامی سطح پر اسلام کی بدنامی کا خطرہ

قادری صاحب فرماتے ہیں کہ عورت کی دیت کے نصف ہونے کا قانون بنانا بین الاقوامی سطح پر اسلامی آئین کی بدنامی کا باعث بن جائے گا۔ اس لئے اس خطرے کے پیش نظر مرد اور عورت کی دیت کے مساوی ہونے کا قانون بنایا جائے۔

تبصرہ

اقوام متحدہ کے منشور میں تمام قوموں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی دی گئی ہے۔ آج کے دور میں تو بین الاقوامی طور پر کئی اقوام اور ممالک بنیادی انسانی اخلاق اور بنیادی انسانی حقوق کو کھلے عام پامال کر رہے ہیں اور ان کو بدنامی کی کوئی پروا نہیں۔ آخر ہم اپنے نظریے اور عقیدے کے مطابق قانون سازی کرنے میں شرم اور ہتک کیوں محسوس کریں؟ اپنی روایات اور اقدار پر سختی کے ساتھ عمل کرنے والی قوموں کا وقار قوموں کی نظر میں بڑھتا ہے گھٹتا نہیں ہے۔ آج کی مادہ پرستانہ تہذیب تو بہت سے "تعدد ازدواج" اور مرد و زن کے اختلاط پر پابندی لگانے کو بھی رجعت پسندی اور عورتوں کی غلامی سمجھتی ہے۔ تو کیا شریعت کی ان پابندیوں کو بھی ختم کرنے کی سفارش قادری صاحب کریں گے؟۔ آج کے دور کی قومیں تو سیکولر سیاست کی علمبردار ہیں تو کیا ہم سیاست میں مذہب کا نام لینا اور سیاست کو مذہب و اخلاق کا پابند بنانے کی بات کرنا بدنامی کے خوف سے ترک کرسکتے ہیں؟۔

جہاں تک عورتوں کے بنیادی انسانی اور اسلامی حقوق کا تعلق ہے اسلام کا مقابلہ اس سلسلے میں دنیا کی کوئی قوم اور کوئی تہذیب نہیں کرسکتی۔ قرآن و سنت اور فقہ اسلامی میں ان کو جو حقوق دیئے گئے ان کو کوئی بھی چھیننے کا حق نہیں رکھتا۔ اگر کوئی چھیننے کی کوشش کرے گا تو اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرہ اس کی دادرسی کرے گا۔ اسی طرح عورت انسانی کرامت و شرافت میں کم تر نہیں ہے۔ کرامت کے اسلامی معیار میں جو عورتیں آگے ہوں گی ان کا مقام بھی بلند ہوگا۔ ہم جیسے مرد ازواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، بنات رسولؐ اور صحابیاتؓ کی خاکِ پا کو بھی نہیں پہنچ سکتے اور آج بھی ایسی خوش قسمت خواتین موجود ہیں جن کے مقابلے میں ہم جیسے مرد کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ لیکن شرعی احکام و قوانین کی پابندی ہم سب پر لازم ہے۔ خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے زیادہ ہمارے مصالح کو سمجھتا ہے۔ اسی شعور کا نام ایمان ہے۔ (بشکریہ "نوائے وقت" لاہور)

اطلاعات و اعلانات

فضیلۃ الشیخ حافظ فتحی (مکہ) رو بصحت ہیں

حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف کے نام مکتوب میں وضاحت

گزشتہ دنوں حج سے واپس آنے والے بعض احباب کی ... ایک نہایت تکلیف دہ اور غیر مصدقہ خبر افواہ کی صورت ... ار کر گئی کہ حافظ فتحی صاحب (خدانخواستہ) وفات پا گئے ... اس پر تشویش بجا تھی کیونکہ چند ہی روز پہلے ان کے ... ت کے باعث ہسپتال میں داخل ہونے کی اطلاع مل چکی ... جس پر ہم نے دعائے صحت کی اپیل کی تھی۔ حضرت مولانا ... طاء اللہ حنیف حفظہ اللہ نے خود ایک خط مکہ مکرمہ روانہ ... جس کے جواب میں ٹیلیفون سے اطلاع مل گئی کہ حافظ صاحب ... اللہ زندہ، سلامت اور رو بصحت ہیں۔ اس کے بعد ... صاحب موصوف کے ہم جلیس اور معاون جناب محمد حنیف ... ب کا مکتوب بنام مولانا محمد عطاء اللہ حنیف مدظلہ موصول ... جس کا ضروری اقتباس درج ذیل ہے۔

"حافظ صاحب کی صحت الحمد للہ بالکل ٹھیک ہے۔ بات ... ہیں، مستشفیٰ سے جو خوراک ملتی ہے اپنے ہاتھ سے پی لیتے ... شوگر کنٹرول میں ہے۔ بلڈ پریشر بھی اب صحیح ہے۔ کمزوری ... ہے۔ وہ انشاء اللہ دور ہو جائے گی۔ زیادہ تشویشناک ... توازن کا مسئلہ تھا وہ الحمد للہ اب بالکل صحیح ہے۔ بات ... تے ہیں اور سمجھتے ہیں، امید ہے چند دن تک مستشفیٰ سے ... ل جائے گی، اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں چلنے پھرنے کے قابل بھی ... اللہ جلد ہو جائیں گے، آپ جیسے بزرگوں کی دعاؤں کی بہت ضرورت ہے"

مولانائے محترم خود بھی حافظ صاحب موصوف کے لئے دعاء ... ہیں اور قارئین سے بھی التماس ہے کہ حافظ صاحب کی صحت کاملہ ... کے لئے صمیم قلب سے دعائیں فرماتے رہیں (ادارہ الاعتصام)

سیرت کانفرنس

۴۔ نومبر بروز اتوار بعد نماز عشاء جامع مسجد اہل حدیث چیچہ وطنی میں جامعہ اشاعت العلوم المحمدیہ کے زیر اہتمام سیرت کانفرنس سے علامہ احسان الٰہی ظہیر۔ مولانا محمد مدنی (جہلم) مولانا عطاء الرحمن صاحب شیخوپوری اور جناب نذیر احمد سبحانی خطاب فرمائیں گے۔

نیز جامعہ ہذا نے قاری محمد اسماعیل صاحب سابق استاد جامعہ ابی بکر کراچی کی خدمات شعبہ تجوید و قرأت کے لئے حاصل کر لی ہیں۔ خواہشمند طلباء کے لئے تمام شعبوں میں داخلہ جاری ہے (شیخ محمد شفیق عتیق ناظم جامعہ اشاعۃ العلوم المحمدیہ چیچہ وطنی ضلع ساہیوال)

دعائے مغفرت

جماعت اہل حدیث منڈی بہاؤالدین کے نائب امیر میاں محمد یوسف صاحب کمبو ۱۱ محرم الحرام کو وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم جماعت کے سرگرم کارکن، صوم و صلوٰۃ کے پابند اور علاقے بھر میں ایک با اثر شخصیت کے مالک تھے۔ قارئین کرام مرحوم کی مغفرت کے لئے دعاء فرمائیں (جمعیت شبان اہلحدیث منڈی بہاؤالدین)

تبدیلی پتہ

میں نے عثمان والا سے باغبانپورہ لاہور میں تبادلہ کروا لیا ہے۔ لہذا احباب درج ذیل پتہ پر خط و کتابت فرمائیں ● ابو القاسم حفیظ اللہ نائب گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ لاہور ● ابو القاسم حفیظ اللہ نائب آصف علی کالونی گلی نمبر ۲ شالامار ٹاؤن سلطان محمود روڈ بجلی گھر باغبانپورہ لاہور

بقیہ • تبصرہ کتب

اس کے حاملین حقیقت کی طرف لوٹنے سے عاری ہوتے جا رہے ہیں۔ بہرحال اہل علم کا فرض ہے کہ ان کو راہ راست دکھاتے رہیں۔ ممکن ہے کچھ سلیم روحیں گمراہی کے گڑھے سے نکل آئیں۔ رانا محمد اکبر صاحب اس سلسلے میں مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ دعوت الی الحق کا فریضہ انجام دے رہے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو مشکور فرمائے۔

PHONE 54406 WEEKLY AL-AITISAM LAHORE R.L No 5523
2-11-84

طابع، چوہدری عبدالستار تبسم ● مطبع، ادمنی پرنٹرز۔ لاہور ● ناشر، محمد عطاء اللہ حنیف ● مقام اشاعت شیش محل روڈ۔ لاہور